Scanned with CamScanner

مدار

علی امام کی سوانح حیات

ناول

شین فرخ

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Farukh, S.
Madaar/ S. Farukh.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2015.
192pp.
1. Urdu Literature - Novel.
I. Title.

2015ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2876-X
ISBN-13: 978-969-35-2876-3

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
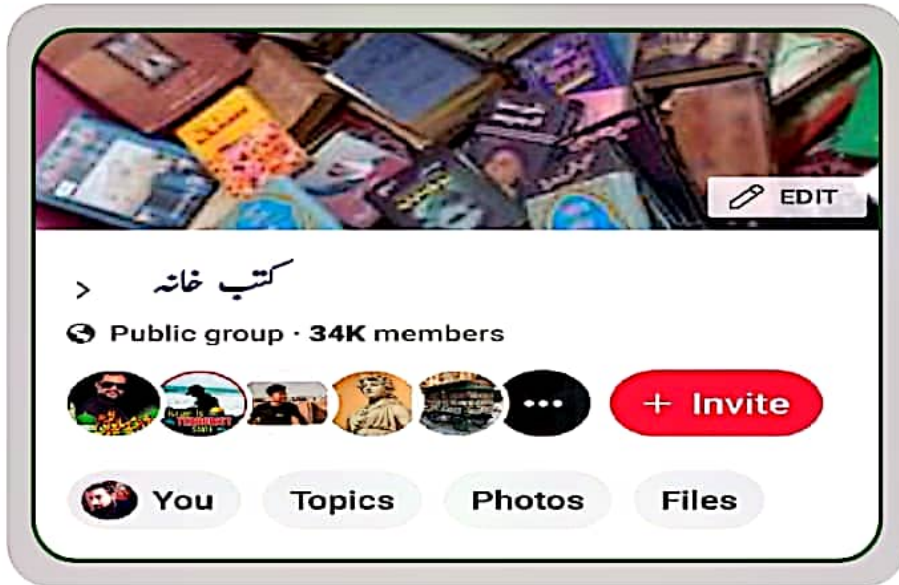
عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

رابعہ زبیری کے نام

ترتیب

رنگ کی پیسٹری (سلیمہ ہاشمی) 7
1- دموہ۔ جبل پور 9
2- بمبئی 22
3- دہلی 33
4- راولپنڈی۔ مری 42
5- لاہور۔ بہاولپور۔ ملتان 56
6- لندن 76
7- کراچی 91

نقش گراں

قطب شیخ۔ مقصود علی۔ احمد پرویز 111-188
منصور راہی۔ لیلیٰ شہزادہ۔ ہاجرہ منصور۔ تصدق سہیل۔ رابعہ زبیری۔ شاہد سجاد۔ انور جمال
شمزا۔ مسعود کوہاری۔ منصور راے۔ مشکور رضا۔ اے آر نا گوری۔ بشیر مرزا۔ نور جہاں بلگرامی۔
اقبال جعفری۔ ضاارام۔ ایم الیف حسین۔ ناہید رضا۔ سلیمہ ہاشمی۔ معین فاروق۔
خارق جاوید۔ عمران میر۔ صاد قین۔ سوزا۔ گل جی۔ قدسیہ نثار۔ وہاب جعفر۔ میزان۔
رشید ارشد۔ مہر افروز۔ سنبل نظیر۔ اقبال مہدی۔ جمیل نقش۔ اقبال حسین۔ مدحہ غزنوی
حرفِ آخر 189
حوالا جات 191

رنگ کی ٹیپسٹری

سلیمہ ہاشمی

پاکستان کے فنون لطیفہ پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جو کچھ دستیاب ہے وہ زیادہ تر انگریزی زبان میں ہے۔ آرٹ کے طلبا، آرٹسٹ بننے کے خواہش مندوں اور عام لوگوں کو شاذ و نادر ہی پاکستان کے آرٹ کی تاریخ کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ حالانکہ حالیہ برسوں کے دوران پاکستان میں آرٹ کی تعلیم اور نمائش کو نمایاں طور پر فروغ ملا ہے۔ ش فرخ کو ان بہت سی شخصیات کی رفاقت حاصل رہی جنہوں نے پاکستان میں ماڈرن آرٹ کی بنیاد رکھی۔ یہ برموقع ہے کہ انہوں نے آرٹ پر موجود تحریروں کے قلیل اثاثے میں اضافے کا انتخاب کیا۔

بظاہر یہ کتاب علی امام کے بارے میں ہے، جنہوں نے پاکستان میں ویژول آرٹس کے ارتقا میں پیش رو کا کردار ادا کیا تھا۔ ش فرخ نے آرٹسٹ کے کام اور زندگی کے سلسلوں کے امتزاج سے ماڈرن ازم کی ہسٹری پیش کر کے اپنے مطالعے کے دائرہ کار میں وسعت پیدا کی ہے۔ قاری اب ان حوالوں کو جاننے لگا ہے جو آرٹ کی تحریکوں کا جواز ہیں۔

پاکستان میں آرٹ کی تعلیم کا آغاز انیسویں صدی میں میو اسکول آف آرٹس لاہور کے قیام سے ہوا، جو دستکاروں کے بچوں کی تربیت گاہ تھی۔ جبکہ پنجاب یونیورسٹی میں فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ 1941ء میں قائم کیا گیا جس کا مقصد اسٹوڈیو آرٹسٹوں کی تعلیم و تربیت تھا۔

تاہم حالیہ برسوں تک معاشرے میں آرٹسٹ کے کردار کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ رویوں میں مثبت تبدیلی، جو کہ اب نظر آنے لگی ہے، اس میں جن چند افراد کی کارکردگی شامل ہے ان میں بلاشبہ علی امام کا نام نمایاں ہے۔

جب پاکستان میں جدید آرٹ کی تحریک نمو پا رہی تھی، ش فرخ کو بطور صحافی، مصنف اور ثقافتی مبصر اس عمل کو قریب سے جاننے کی سہولت میسر تھی۔ وہ سب تذکروں، روایتوں اور سماجی اور سیاسی حالات کی گواہ ہیں جو فنون لطیفہ کے ارتقا کی اساس ہیں۔

فرخ کو یہ ادراک ہے کہ معروضی اور معاشرتی حالات فنون لطیفہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ عموماً لوگ ایسے بہت سے حوالوں سے نا آشنا ہیں۔ مصنف نے حالات و واقعات کو بہت محنت اور جانفشانی سے جزو بہ جزو ترتیب دیا ہے۔ انھوں نے آرٹ پر اثر انداز ہونے والے عوامل، شخصیات، تحریکوں اور اصطلاحات کی پہچان بیّن کے بعد سہل انداز میں پیش کر کے قارئین کے لیے قابلِ فہم بنایا ہے۔

یہ تصنیف جس آرٹسٹ کی زندگی کی دستاویز ہے وہ حقیقی طور پر مرکزی نقطہ ہے۔ لیکن وہ وسیع کینوس پر ایک موقف کی مانند ہے۔ ان کے اسٹیج کو موزیک کی مانند وضع کیا گیا ہے۔ ایک کشادہ تصویر میں سرتاسر رنگ و نقش کے دریا بہتے ہیں اور ہر موج اپنے جلو میں منطقی اور تاریخی مفہوم سمیٹے ہوئے ہے۔

1947ء کی تاریخی شورش کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ناموافق حالات نے جن لاکھوں شخصیتوں کو یکسر تبدیل کر دیا تھا علی امام ان میں سے ایک تھے۔ جو نامہربان اور ثقافتی طور پر اجنبی ماحول سے دوچار ہوئے۔ مگر انھوں نے اپنی جدوجہد کے دوران نجی زندگی اور کام میں توازن برقرار رکھا۔ فرخ نے اپنے کثیر الرنگی بیانیہ میں زندگیوں اور فنون لطیفہ کو متصل کیا ہے۔ نجی زندگی عوامی شخصیت کی کسوٹی ہے۔ مصنف نے بہت سے دھاگوں کے امتزاج سے عام قاری کو ایک پرکشش عہد سے روشناس کروایا ہے۔

1

گھڑسوار نے گھنے جنگل کے اونچے پیڑوں کے پیچھے سے گزرتے ہوئے پتوں سے چھنتی ہوئی سنہری روشنی کو دیکھا۔ سورج ابھی تک چمک رہا تھا۔ وہ آج معمول سے پہلے فارغ ہو گیا تھا۔ لیکن دن بھر کی گشت نے اسے تھکا دیا تھا۔ اس نے گھوڑے کی باگ ڈھیلی کی اور اسے خودرو گھاس میں بننے والی تنگ زمین کی پگڈنڈی پر چھوڑ دیا۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ جانور کو راستہ دکھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ از خود گھر کی جانب بڑھتا جاتا تھا۔ گھڑسوار نے درختوں کے جھنڈ سے کھلی جگہ پر آکر پہاڑی ٹیلوں کی چوٹیوں اور ڈھلوانوں پر بنی ہوئی قبائلیوں کی جھونپڑیوں، جو دور سے چھتے کی مانند لگتی تھیں، پر نظر ڈالی۔ دو عورتیں سروں پر گھڑے اٹھائے بلندی کی طرف جا رہی تھیں۔ ایک عورت سر پر گھڑا اور بغل میں بچے کو اٹھائے تھی۔ یہ وہ فاریسٹ آفیسر رضی حیدر تھا۔

اردلی رامو تمباکو اور کوئلے کو چلم میں بھر کر پھونک مارنے والا تھا کہ مالک کو آتے دیکھا تو چلم کو زمین پر رکھ کر گیٹ کی طرف بھاگا۔ انہوں نے گھوڑے کی لگام رامو کے سپرد کی۔ ٹوپی اتاری۔

"آج نندلال نظر نہیں آ رہا۔ کیا جلدی چلا گیا؟" رضی حیدر نے رامو سے پوچھا۔

"صاحب جی، وہ کئی روز سے پریشان ہے۔ اس کا بیٹا بیمار رہتا ہے۔ کسی جادو منتر سے ٹھیک نہیں ہوا۔ پنڈت نے کہا ہے کہ یہ جھگی منحوس ہو گئی ہے۔ کہہ رہا تھا کہ وہ آج نئی جھگی بنائے گا۔"

"اوہ اچھا" رضی حیدر کو قبائلیوں کے اس ٹوٹکے کا علم تھا کہ کوئی ناگہانی آفت پڑے تو وہ پرانی جھگی ڈھا کر کسی دوسری جگہ نئی جھگی بنا لیتے ہیں۔ آگے بڑھے تو ان کی نظر اپنے بیٹے سعید پر پڑی۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔

باپ نے پوچھا۔ "ارے بھئی سعید کیا ہوا؟ کیا بھائیوں سے پھر جھگڑا ہو گیا۔ یہ یوسف اور رضا کہاں ہیں؟"

سعید نے باپ کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ رضی حیدر نے بیوی کو آواز دی۔ "طاہرہ بیگم! یہ سعید کیوں رو رہا ہے؟"

"کیا بتاؤں جی۔ میں نے بچوں سے پوچھا تھا کہ آج رات کے لیے کیا پکاؤں۔ سب نے کہا دال چاول۔ سعید یہ سن کر

رونے لگا۔ نواب صاحب کو گوشت چاہیے۔ انہیں دال چاول نہیں کھانے۔"

رضی حیدر نے اپنی رائفل کا اسٹریپ جو کچھ دیر پہلے ڈھیلا کیا تھا اسے پھر سے کسا اور باہر کی طرف چل دیے۔ طاہرہ بیگم نے آواز دی۔

"کہاں جا رہے ہیں۔ چائے تو پی لیں۔" لیکن رضی حیدر نے گھوڑے کی کاٹھی پر بیٹھ کر باگ کھینچ دی تھی۔

رضی اور طاہرہ کے تیسرے بیٹے کا نام سید محمد علی امام تھا۔ دیگر بیٹوں کے نام بھی سید سے شروع ہوتے تھے۔ لیکن سب انہی کو سید یا سید بھائی کہہ کر پکارتے تھے۔

سید علی امام کی پیدائش نرسنگھ پور میں ہوئی۔ ہندوستان میں مدھیہ پردیش کے مرکز میں واقع نرسنگھ پور تاریخی اور دلکش فطری مناظر کی وجہ سے اہم مقام رکھتا تھا۔ شمال میں مدھیاچل اور جنوب میں ست پڑا کے پہاڑی سلسلے اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ نرسنگھ پور کے شمالی علاقے میں نرمدا دریا جسے گنگا کی طرح پوتر قرار دیا جاتا ہے۔ مشرق سے مغرب کی طرف بہتا ہے اس پر عظیم جنگجو رانی درگاوتی نے طویل عرصے تک حکمرانی کی۔ اٹھارویں صدی میں جاٹ سرداروں نے یہاں ایک بڑا مندر تعمیر کیا۔ اس میں نرسمہا دیوتا کی مورتی رکھی اور اس کی پوجا کرتے تھے۔ اور گڈریا کھیڑا گاؤں کا نام نرسنگھ پور رکھ دیا گیا۔

سید کے آباؤ اجداد مغل بادشاہوں کے ہمراہ مشہد سے ہندوستان آئے تھے اور حیدرآباد دکن میں بس گئے تھے۔ ان کے پردادا انگریز سامراج سے آزادی کی جنگ میں سرگرم تھے۔ جس کی پاداش میں انہیں پھانسی دے دی گئی تھی۔ خاندانی پیشہ چڑی گری یعنی پرندوں کا کاروبار تھا۔ رضی حیدر جوان ہوئے تو ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گئے۔ وہ جوان کی ہونے والی بیوی طاہرہ کی بڑی بہن تھی۔ طاہرہ کو اس معاملے کا بخوبی علم تھا۔ جب یہ بات خاندان کے بڑوں تک پہنچی تو انہوں نے واویلا کرنے کے بجائے استخارہ نکالنے کی تجویز پیش کی۔ یہ ان کی روایت اور عقیدہ تھا۔ بلکہ بعض اوقات لڑکے لڑکی کی شادی سے پہلے شجرہ نسب بھی دیکھا جاتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ کسی نے غیر سید یا غیر شیعہ سے شادی کر لی ہو اور خون میں ملاوٹ آ گئی ہو۔

رضی کے والدین کی طرف سے رشتے کی مخالفت پر تین بار استخارہ کیا گیا۔ لیکن ہر بار وہ غلط ثابت ہوتا۔ آخر بزرگوں نے فیصلہ کیا کہ رضی کی شادی طاہرہ بیگم سے طے کر دی جائے۔

کسی نے آ کر طاہرہ کو یہ خبر سنائی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

میں جانتی ہوں وہ آپا سے محبت کرتا ہے۔ میں اس کی مرضی کے بغیر اور زبردستی اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ بہتر ہے اس شخص کے بجائے میری شادی کسی گھوڑے کے ساتھ کر دی جائے۔

لیکن کسی نے اس کی بات نہ سنی۔ بزرگوں کا فیصلہ آخری تھا اور سید رضی حیدر اور سیدہ طاہرہ بیگم کی شادی ہو گئی۔ ان کے

ہاں پانچ بچوں کی ولادت ہوئی بڑی بیٹی مہدی بیگم تھی۔ پھر یوسف رضا، سید رضا، علی امام اور حسن رضا۔

گھوڑے کی ٹاپ سن کر بھائی باہر نکلے۔ ابا کے ہاتھ میں تازہ شکار کیا ہوا تیتر تھا۔ اس کی گردن سے خون ٹپک رہا تھا۔

حسن نے آواز دی۔ ''سید بھائی، دیکھو ابا تمہارے لیے تیتر لائے ہیں۔''

یوسف نے سید کا کندھا تھپکا۔ ''اے یار اب تو خوش ہو جا۔''

جنگلات کے افسر کے دسترخوان پر شکار کیے ہوئے پرندوں کا بھنا ہوا گوشت معمولات میں شامل تھا۔ لیکن اس روز کا تیتر سید کے لیے باپ کی محبت کا تحفہ تھا۔

موسم خوشگوار تھا۔ ساون کی برسات رات بھر کے بعد تھمی تھی۔ تاہم آسمان ابر آلود تھا۔ لڑکوں کا جی مچل رہا تھا کہ باہر نکلیں لیکن اماں نے منع کر دیا کہ بارش کے بعد سانپ بچھو نکل آتے ہیں۔ ابا نے سنا تو کہا ''کوئی بات نہیں۔ بیچارے کتنے دنوں سے گھر میں بند رہے ہیں۔ چلو بھئی تیار ہو جاؤ۔ میں بھی چلوں گا۔''

''سید'' یوسف نے آواز دی۔ ''سید ہم سب ابا کے ساتھ جنگل کی طرف جا رہے ہیں، چلو''

''اماں یار یہ سید کہاں چلا گیا۔'' یوسف مایوس ہونے لگا تو سید سامنے سے آتا دکھائی دیا۔

''تم لوگ جاؤ۔ میرا جی نہیں چاہ رہا۔'' سید نے کہا۔

''تم نہیں جاؤ گے تو ہم بھی ابا کو انکار کر دیں گے۔''

ابا کا نام سن کر سید یکدم تیار ہو گیا۔

چاروں بھائی اچھلتے کودتے، شاخوں کے درمیان اڑتے ہوئے پرندوں کی شوخیوں سے محظوظ ہوتے ہوئے بڑھ رہے تھے کہ رستے میں پڑی ایک موٹی لمبی لکڑی پر حسن کا پاؤں پڑ گیا۔ رضا نے پلٹ کر کہا۔ ''دھیان سے چلو، زمین گیلی ہے کہیں پھسل نہ جاؤ۔'' اتنے میں اس لکڑی میں ہل جل ہوئی۔ ''اے، یہ لکڑی نہیں سانپ ہے۔''

''کوبرا، چلو بھاگو۔'' سید چلایا۔ ''نہیں بابا میں نہیں جاتا۔ آپ لوگوں کے ساتھ، میں نے پہلے بھی منع کیا تھا۔''

''بھئی سید، ڈرنے کی کیا بات ہے۔ ہم ابھی اسے مار دیں گے۔'' یوسف نے ایک بڑا پتھر اٹھایا کہ سانپ کا سر کچل دے۔

''ٹھہرو'' کچھ فاصلے پر چلتے ہوئے ابا نے آواز دی۔ ''تم اسے کچھ نہ کہنا، پھر وہ تمہیں بھی کچھ نہیں کہے گا اور اپنے گھر

چلا جائے گا۔" ایسے ہی ہوا، وہ لمبی لکڑی کھسکنے لگی اور کچھ لمحوں میں غائب ہو گئی۔

سید کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ "بھئی سانپ تو اپنے گھر چلا گیا۔ دیکھا اس نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا۔" رضا سید کو بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"سید بھائی تو ہیں ہی ڈرپوک۔" حسن نے یوسف کے کان میں ہولے سے کہا۔

"جانتا ہوں۔ اس روز ابا نے ہیٹر کو نشانہ بنا کر گولی چلائی تو اس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں۔" یوسف نے حسن کی تائید کی۔

"تم نے دیکھا نہیں اس نے آنکھوں پر رومال بھی رکھا ہوا تھا۔" حیدر نے کہا۔

جنگل کے اس بنگلے کے آس پاس بہت چہل پہل تھی۔ قبائلی عورتیں شوخ رنگوں کے گھگھرے اور چولیاں پہنے اور سروں پر مٹکے رکھے رقص کر رہی تھیں۔ سورج کے ڈھول کی تھاپ جوشیلی تھی۔ جب سے وہ نئی بیوی لایا تھا اس کی ڈھلتی ہوئی جوانی نکھر گئی تھی۔ رضی حیدر بڑی دیر سے اس کے جوش و خروش کو دیکھ رہے تھے۔ سورج نے انہیں قریب پا کر ڈھول روکا اور نمسکار کیا۔ رضی حیدر مسکرائے۔ "سنا ہے تم نے تیسری بیوی کر لی۔"

سورج کھسیایا۔ "جی صاحب، یہ بھگوان کی کرپا ہے۔ میرے باپ نے بھی چار شادیاں کی تھیں۔ صاحب اسی سے تو مرد کی عزت ہوتی ہے۔"

"جیسے تمہاری خوشی۔ لیکن اپنی بیویوں اور بچوں کو کھلانے کے لیے کیا کرے گا۔"

"جی صاحب، وہ..." سورج کو کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

مدھیہ پردیش کا یہ جنگلاتی علاقہ انگریز حکمرانوں کی پسندیدہ شکارگاہ تھی۔ ان کی سیر و تفریح اور دیگر انتظامات کی ذمہ داری فارسٹ آفیسر پر ہوتی تھی۔ اب کے وائسرائے کا پیغام آیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے ہمراہ شکار کے لیے آئیں گے۔ لاٹ صاحب کی آمد مقامی لوگوں کے لیے بڑی خوش خبری تھی۔ شکار کے دنوں میں انہیں معمول سے زیادہ مزدوری کے علاوہ شکار کا گوشت بھی ملتا تھا۔ جتنا بڑا شکار ان کے اتنے ہی وارے نیارے۔ انہیں چند روز کے لیے باجرے کی روٹی اور ترکاری سے نجات مل جاتی۔ وہ شکار کیے ہوئے جانوروں کے خون کو کھا کر چکھتے جاتے اور دعوت اڑاتے۔

"میں سچ کہتا ہوں اماں۔ میں نے سید بھائی کی کتابوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ وہ مانتے ہی نہیں۔ انہوں نے مجھے ڈانٹے

زور سے چپت لگائی۔ "یہ دیکھو۔" حسن قمیص اٹھا کر اپنی پیٹھ پر سید کی انگلیوں کے نشان دکھا رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ بڑا بھائی ہے۔ تم پرواہ نہ کرو۔ میں اسے سمجھا دوں گی۔" ماں نے حسن کو پیار کیا۔

رضی حیدر وائسرائے اور ان کی میم کو ڈاک بنگلے میں منتقل کرنے کے بعد کچھ دیر کو آرام کرنے گھر آئے تھے۔ ماں نے بچوں کو چمکارا کہ شور نہ مچاؤ۔ تمہارے ابا تھکے ہوئے آئے ہیں۔ سب بھائی برآمدے میں نکل آئے۔

سید نے سہمی ہوئی میں حسن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "وہ دیکھو حسن، رامو اور نندو بھاگتے ہوئے آ رہے ہیں۔"

اتنے میں وہ دونوں گیٹ کے اندر داخل ہوئے۔ تیز بھاگنے سے ان کی سانسیں پھول رہی تھیں۔

رامو بولا۔ "جی رینجر صاحب کہاں ہیں۔ انہیں جلدی بلاؤ۔"

"کیا ہوا؟" یوسف آگے بڑھا۔

"وہی شیر آ گیا۔ نندو نے خود اسے دیکھا ہے۔ وہ تو ڈھول کی آواز سن کر جھاڑیوں میں چھپ گیا ورنہ نندو کو کھا جاتا۔"

فاریسٹ آفیسر نے سرپٹ گھوڑا دوڑایا۔ ڈاک بنگلے میں پہنچے تو دونوں گورے میاں بیوی صحن میں چارپائی پر بیٹھے تھے۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ معلوم کرتے شیر دیوار پھلانگ کر سامنے آ گیا۔ میم صاحب نے زور سے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔ رضی حیدر نے پلٹ میں گولی چلائی تو شیر کی آنکھ زخمی ہو گئی۔ جس سے وہ اور بپھر گیا۔ رضی حیدر مورچے کی طرح اپنے مہمانوں کے سامنے ڈٹ گئے اور پے در پے اس کو گولیاں چلائیں۔ شیر ڈھیر ہو گیا تھا۔ اتنے میں دموہ کا ڈاکٹر پہنچ گیا تھا۔ ڈاکٹر بمشکل میم صاحب کو ہوش میں لایا۔ رضی حیدر آگے بڑھے۔ "میڈم فکر نہ کریں۔ شیر مارا گیا ہے۔" وائسرائے اپنی بیوی کی جان بچ جانے پر بہت خوش تھے۔

اگلے روز سید اسکول کے دوستوں کو اپنے ابا کی بہادری کے قصے سنا رہا تھا۔

○

دموہ کے پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر ترلوک جی بچوں کی ذہنی تربیت اور نظم و نسق کی بنا پر علاقے بھر میں مشہور تھے۔ وہ اسکول کے مقررہ اوقات کے علاوہ طلبا کو صوبائی حکومت کی طرف سے وظیفے کے امتحان کی تیاری کے لیے مفت کوچنگ دیتے تھے۔ اس بار صوبے بھر میں گیارہ طلبا کو وظیفے کے قابل قرار دیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک طالب علم سید علی امام تھا۔ سید کو ماں کی طرف سے 3 روپے ماہانہ جیب خرچ ملتا تھا۔ اب وہ دگنا ہو گیا تھا۔ کیونکہ حکومت کی طرف سے بھی اسے 3 روپے ماہانہ وظیفہ ملنے لگا تھا۔

سید کے استاد ٹھیک جی کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ وہ روزانہ اپنی کلاس کے طلبا کو نت نئے موضوع پر لکھنے کے لیے کہتے۔ وہ آج اور کس روز کونسے موضوع پر لکھنے کا کہیں گے۔ اس بارے میں کسی کو پہلے سے کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا۔

ٹھیک جی کلاس میں داخل ہوئے۔ بچے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ آج ماسٹر جی ہم سے کیا لکھوائیں گے۔

دموہ کے اسکولوں میں انگریزی اور ہندی پڑھائی جاتی تھی۔ ذریعہ تعلیم بھی انہی دو زبانوں میں تھا۔

''ہاں بھی بچو، آج تم لوگ اپنے شہر کے بارے میں لکھو۔ تمہارے پاس 20 منٹ ہیں۔''

کلاس کے لڑکے جو اپنے استاد کو غور سے دیکھ رہے تھے اب وہ اپنی کاپیوں پر جھکے لکھ رہے تھے۔ علی امام نے لکھا تھا ـــ

''ہمارا شہر دموہ گھنے جنگلات سے گھرا ہوا ہے۔ جنگل میں اونچے اونچے سرسبز درخت ہیں۔ برسات کے موسم میں آسمان پر کالے بادل چھا جاتے ہیں۔ پھر بہت تیز بارش ہونے لگتی ہے۔ جنگل میں خوبصورت پرندے اور جانور پائے جاتے ہیں۔''

ماسٹر جی نے باری باری سب لڑکوں کی کاپیاں چیک کیں۔ ''شاباش، تم لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ٹھیک ہے لیکن کیا کسی کو معلوم ہے کہ اس شہر کا نام دموہ کیوں رکھا گیا؟''

سب ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔ ٹھیک جی مسکرائے۔

بچوں کے نصاب میں رامائن، مہابھارت اور گیتا شامل تھے۔ انہیں رام، ارجن اور دیگر دیومالائی سورماؤں کے بارے میں بھی پڑھایا جاتا تھا۔

''سنو'' ٹھیک جی نے لڑکوں کو متوجہ کیا۔ ''ہمارا یہ شہر دموہ مدھیہ پردیش کی ساگر ڈویژن میں واقع ہے۔ یہ صدیوں پرانا تاریخی شہر ہے۔ ایک زمانے میں اس علاقے پر راجہ نل کی حکومت تھی اور اس شہر کا نام ان کی بیوی دمیانتی کے نام پر رکھا گیا تھا۔

سید کی ماں امید سے تھیں۔ ان کے ہاں چھٹا بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ ابا اس خبر پر خوش بھی تھے اور کچھ فکرمند بھی۔ وہ ایک باصلاحیت اور دیانت دار افسر تھے۔ ان کی یہی خوبیاں ان کے لیے پریشانی کا باعث بنتی تھیں۔ کیونکہ یہ سب اعلیٰ افسران کے مفادات کے خلاف تھا۔ اس لیے آئے دن ان کا تبادلہ کر دیا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے بچوں کی تعلیم کو بھی نقصان پہنچتا تھا۔ ان دنوں بھی کچھ ایسی ہی خبریں آ رہی تھیں۔ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ بیوی کی زچگی کے دوران اگر ان کا تبادلہ ہو گیا تو وہ صورت حال کو کیسے سنبھالیں گے۔ ان کی گھریلو ملازمہ بوا نے تجویز پیش کی کہ مالکن کو اس کی ماں کے پاس بھیج دیا جائے۔ وہاں ان کی دیکھ

بھالی اچھی طرح ہوگی۔ سید کی اماں نے جب شوہر کو یہ بتایا تو وہ کہنے لگے۔

"مجھے ہلا کی ماں پر بھروسہ ہے۔ لیکن گھر اور بچوں کو کون سنبھالے گا۔"

ماں نے کہا۔ "ہلا تو ادھر ہی رہے گی۔ اسے کھانا پکانا بھی آ گیا ہے۔ کہہ رہی تھی اس کی چھوٹی بہن کملا بھی آ جائے گی۔ وہ کام کاج میں ہاتھ بٹا دیا کرے گی۔"

"مگر وہ تو شادی شدہ ہے۔ وہ اپنا گھر چھوڑ کر کیوں آئے گی۔"

"اس کا شوہر کم بخت بڑی عمر کا ہے۔ ویسے بھی نشئی اور نکھٹو ہے۔"

رضی حیدر مان گئے اور سید کی ماں زچگی کے لیے ہلا کی ماں کے پاس چلی گئی۔ سید کا چھوٹا بھائی آیا تھا۔ اس کا نام محسن رضا رکھا گیا۔

سر دست رضی حیدر کا تبادلہ رک گیا تھا۔ ماں محسن کو گود میں لئے گھر لوٹ آئیں۔ ایک روز سید اسکول سے لوٹا تو اماں کو پریشان پایا۔ ابا پچھلے چند روز سے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ اسی صبح لوٹے تھے۔ یوسف، رضا اور آپا محمدی بھی چپ چپ تھیں۔ کوئی کچھ نہیں بتا رہا تھا۔

"ابا نے کملا کے ساتھ شادی کر لی ہے۔" یوسف نے سید کو خبر دی۔

"نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ کملا تو بیاہی ہوئی تھی۔" رضا کو معلوم ہو چکا تھا۔ مگر وہ اب بھی اس امکان کو جھٹلانا چاہتا تھا۔

"ابا نے اس کے شوہر سے طلاق دلا دی ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"ہو گیا ہے یار، ابا نے اسے 400 روپے دیے تو بڈھا مان گیا۔"

"ابا کون سے جوان ہیں۔ 56 سال کے ہونے والے ہیں۔"

"کملا تو ابھی پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔"

"میں نہیں مانتا کہ ابا جیسا فرشتہ آدمی ایسی حرکت کر سکتا ہے۔" سید بھائیوں کے درمیان تکرار کو صبر سے سن رہا تھا۔

محمدی آپا اپنے دکھ کو ہمیشہ کی طرح خاموشی سے سہہ رہی تھیں۔ "ابا نے اپنی زندگی کے 25 سال ہماری ماں کے ساتھ گزارے۔ اس عمر میں آ کر اپنی بیٹی کے برابر کی لڑکی سے شادی کر لی۔ سید خاندان کے بیٹے نے ایک ہندو لڑکی سے شادی کر لی۔"

سید ابھی کم سن تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے تو یہ تکلیف تھی کہ ابا اب ان کے ساتھ نہیں رہتے تھے۔

ایک روز وہ شام کے وقت گھر لوٹا تو دیکھا کہ ابا کا گھوڑا کھڑکی کے سامنے بندھا تھا۔ وہ ابا سے ملنے کے لیے لپک کر اندر کی طرف بڑھا۔ اندر سے جھگڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ وہیں رک گیا۔

"تم نے میری زندگی برباد کردی ہے۔" اماں کہہ رہی تھیں۔

"اگر یہ میری غلطی تھی تو میں اسے مانتا ہوں لیکن میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔" سید کے ابا نے اپنی غلطی کے ساتھ نباہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔

سید نے بھائیوں سے سنا تھا کہ ابا نے امی کو منانے کی بہت کوششیں کیں۔ لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہیں کہ ان کے بیچ میاں بیوی کا رشتہ ختم ہو گیا ہے۔ سید کے لیے یہ ایک شدید دھچکا تھا کہ اس کے ابا اب کبھی ان کے ساتھ نہیں رہیں گے۔ وہ اپنے آپ میں الجھتا تھا۔ بار بار اپنے دل میں کہتا تھا کہ امی مان کیوں نہیں جاتیں۔

اب وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتا تھا اور اپنے اندر کا غصہ کھیل کے میدان میں نکالتا تھا۔ وہ کرکٹ اور ہاکی کا کھلاڑی بن گیا تھا۔

وہ اسکول سے واپسی پر بازار میں رک گیا۔ مقامی لوگوں کا ایک گروہ مرغوں کی لڑائی کے تماشے کے اردگرد جمع تھا۔ سید کو اس خونخوار کھیل سے گھن آرہی تھی۔ وہ کھڑے کھڑے دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا کلاس فیلو آنند مرغوں کی لڑائی میں مگن تھا۔ علی امام کو دیکھا تو قریب آیا۔ "مرغوں کا تماشا ادھر ہو رہا ہے۔ تم اس کونے میں آکر کھڑے ہو گئے۔ کسی کا انتظار ہے کیا۔"

"ہاں، آج پانڈو چاچا نہیں آیا۔"

امام صبح گھر سے نکلتا تو دوپہر کے کھانے پر بھی گھر نہیں آتا تھا۔ وہ بازار سے کچھ نہ کچھ خرید کر کھا لیتا تھا۔ جن دنوں شہر میں تھیٹر آیا ہوتو اس کے مزے ہو جاتے تھے۔ وہ آج بھی رام لیلا دیکھنے جا رہا تھا۔ بھوک لگی تھی لیکن پانڈو چاچا—— اتنے میں سائیکل کی گھنٹی بجی۔ پانڈو چاچا ہمیشہ کی طرح سفید پاجامہ کرتا، سیاہ واسکٹ اور ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ امام کو دیکھ کر سائیکل سے اترا۔ یہ ان کا مستقل گاہک تھا۔ پانڈو نے سائیکل کی پشت پر بندھے ہوئے لکڑی کے صندوقچے کا ڈھکنا کھولا۔ اس میں ملائی ربڑی کا لبوترا کٹورا گرم کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے ملائی ربڑی کا ایک ٹکڑا چاقو سے کاٹا، اسے پیپل کے پتے پر رکھ کر امام کو دیا۔ امام کے چہرے پر رونق آگئی تھی۔ پانڈو گھنٹی بجاتا، ملائی ربڑی کی آواز لگاتا دوسری گلی میں مڑ گیا۔ امام اپنے دوست آنند کو لے کر تھیٹر دیکھنے چلا گیا۔

اتوار کا دن تھا۔ سب بھائی ناشتے کے بعد بیٹھک میں ہوم ورک کرنے لگے۔ یوسف کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے

کچھ سوچتے ہوئے سید کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

"یار سید، ایک آئیڈیا ہے۔"

"کیا۔ کہیں جانے کا پروگرام ہے کیا۔"

"نہیں بھئی، ہم ایک پرچہ نکالیں گے۔"

"پرچہ؟...... کون سا پرچہ۔"

"بھئی میگزین، اسکول میگزین۔"

"پیسے کہاں سے آئیں گے؟ اس کے لیے لکھے گا کون، اس کا نام کیا ہوگا۔" سید نے ایک ساتھ بہت سارے سوال کر دیئے۔

"نام تو میں نے سوچ لیا ہے۔ اس کا نام ہوگا "پشپا انجلی"

"او، وری گڈ"

یوسف ہمیشہ سے ہر تحریر کی طرف مائل تھا لیکن سید لکھنے میں زیادہ تیز نہیں تھا۔ طے یہ پایا کہ اسکول کے جو لڑکے لکھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں، انہیں اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔ اگلے اتوار کو ایک میٹنگ رکھی گئی۔ سب نے متفقہ طور پر یہ مشورہ دیا کہ رسالے کا ایڈیٹر یوسف رضا ہوگا۔ علی امام اس کا ٹائٹل کور بنائے گا۔ اس وقت تک علی امام کو قطعی یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ تصویر بنا سکتا ہے۔ البتہ اس نے اپنے بڑے بھائی حیدر رضا کو تصویریں بناتے دیکھا تھا۔ وہ جب بھی تصویر بناتے تو علی امام ان کے پاس جا بیٹھتا۔ حیران ہوتا تھا کہ وہ مختلف رنگوں اور لائنوں سے سفید کاغذ پر کیسے خوبصورت نقوش بنا دیتے ہیں۔ وہ بڑی دیر تک اس تاثر میں گم رہتا۔

پشپا انجلی نکالنے کے بارے میں اسکول کے لڑکوں میں بہت جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔ جسے دیکھو کچھ نہ کچھ لکھ کر چلا آتا۔ کسی کے ہاتھ میں کوئی نظم ہوتی تو کوئی کہانی لکھ کر لے آتا۔ یوسف اور علی امام کا اوطاق میگزین کا دفتر بن گیا تھا۔

"سید، دیکھو جو کہانی لایا ہے وہ کچھ گڑبڑ ہے۔"

"کیا بھائی، اس نے کیا لکھا ہے۔"

"اس نے لکھا ہے کہ سندھ میں برسوں پہلے بہت خوبصورت مندر ہوا کرتے تھے۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں بہت سے مندروں کو ڈھا دیا گیا اور اس کا سامان قلعے کی تعمیر میں استعمال کیا گیا تھا۔"

"بھائی ایسا ہوا ہوگا۔"

"ایک بات تو یہ ہے کہ شہنشاہ اکبر اس طرح کے تعصبات کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا تھا جس سے کسی کے مذہبی عقیدے کو ٹھیس پہنچے۔ بہر حال یہ کہانی اگر درست بھی ہے تو ہمیں چھاپنی نہیں چاہیے۔ تمھیں پتہ ہے ہمارے اسکول میں بہت کم مسلمان لڑکے ہیں۔ کہیں انہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔"

"ہاں بھائی یہ تو ٹھیک ہے۔ ہم اس چکر میں نہیں پڑتے۔"

"اچھا تو تم نے کامکس بنا لیا۔"

"یوسف بھائی! میں اس روز آنند کے ساتھ رام لیلا دیکھنے گیا تھا۔ اس میں ایک ایپی سوڈ مجھے بڑا اچھا لگا۔"

"کون سا؟"

"بھائی، وہی جو ہم نے رامائن میں بھی پڑھا تھا کہ جب رام چندر، سیتا اور لکشمن کے ساتھ اپنی سوتیلی ماں کی بد سلوکی پر جنگل کی طرف کوچ کر گئے تھے تو ان کا سوتیلا بھائی بھارت اجودھیا میں نہیں تھا۔ اس نے ماں کی خواہش پر تخت نشینی سے انکار کر دیا تھا۔"

"ہاں وہاں اور بھارت نے رام چندر کی کھڑاویں تخت پر رکھ دی تھیں کہ وہی راج گدی کا حق دار ہے۔"

"میں اس کی تصویر بناؤں؟ بھائی ہم اسے اپنے میگزین پر چھاپیں گے۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے۔ کوشش کرو، دیکھتے ہیں کیسی بنتی ہے۔ لیکن تمھیں اس کا اسکیچ بلیک اینڈ وائٹ میں بنانا ہوگا۔"

علی امام نے حامی بھر لی۔ لیکن یہ سوچ رہا تھا کہ رنگ کے بغیر مزہ نہیں آئے گا۔

میگزین نے علی امام کو بھرپور مشغولیت دی تھی۔ اسے نہ صرف تصویر بنانے میں مزہ آنے لگا تھا بلکہ وہ بھائی کا ہاتھ بٹانے کے لیے اوپر کے کام بھی کرتا تھا۔ اب اس کے جیب خرچ کا ایک بڑا حصہ میگزین کے اخراجات میں جانے لگا تھا۔ سب سے اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ پشپانجلی نے علی امام کو اپنے اندر کے مصور کی کھوج لگانے کا موقع دیا تھا۔

سیٹھ کے احاطے میں رہنے نہیں آئے تھے۔

ان دنوں ان کی تنخواہ صرف سو روپے ماہوار تھی۔ جس میں سے وہ 100 روپے بیوی بچوں کے خرچ کے لئے بھیجتے تھے۔ اس میں وہ کبھی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس ماہ ان کا منی آرڈر نہیں آیا تھا۔ گو کہ اماں ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم بچا لیتی تھیں۔ پھر بھی کنبے بھر کے اخراجات پورے کرنا محال تھے۔ بچوں کے نانا اور ماموں اب ان کے ساتھ رہتے تھے۔ ماں کو والد اور بھائی کی موجودگی میں تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن کبھی یہ خیال آتا کہ دونوں کے اخراجات کا اضافی بوجھ ہے ورنہ وہ بچوں کو بہتر کھانا

دے سکتی ہیں۔ بیٹی جوان تھی اور اڑکے بڑے ہو رہے تھے۔ اسی دوران رضا نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی جا کر پڑھنا چاہتا ہے۔ اب کے منی آرڈر کے بجائے اردلی آیا تھا۔ رضی حیدر نے اس کے ہاتھ رقم بھجوادی تھی اور یہ پیغام بھی تھا کہ وہ بیماری کی وجہ سے بروقت رقم نہ بھجوا سکے۔

باپ کی بیماری کا سن کر بچے پریشان ہو گئے۔ ماں نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن وہ اندر ہی اندر دکھی تھیں۔ سید اور حسن نے یوسف بھائی سے کہا کہ ہم ابا کو ملنے جانا چاہتے ہیں لیکن اماں سے ڈر لگتا ہے۔ یوسف نے وعدہ کیا کہ وہ ان سے بات کریں گے۔

یوسف کی وساطت سے حسن اور سید کو باپ کے پاس جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ دونوں بچوں سے بغلگیر ہوتے وقت شیر کے بہادر شکاری کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ تینوں باپ بیٹے اوطاق میں بیٹھے تھے کہ اندر سے کچھ کھٹکا ہوا۔ رضی حیدر اٹھ کر اندر گئے۔ لوٹے تو ان کے ہاتھ میں کھانے کی سینی تھی۔

"چلو بھئی، ہاتھ دھو کر آؤ اور کھانا کھاؤ۔"

دونوں بھائی کھانے کے سامنے بیٹھے تو دیکھا کہ وہاں صرف دو تھالیاں تھیں۔

"ابو آپ ... کیا آپ کھانا نہیں کھائیں گے۔"

"بیٹا میں اندر کھاؤں گا۔ تم لوگ شروع کرو۔"

حسن مچلا۔ "میں تو آپ کے ساتھ کھاؤں گا۔"

سید تذبذب میں تھا۔ لمبا سفر کر کے آئے تھے۔ بھوک لگ رہی تھی۔ مگر وہ ہاتھ روکے بیٹھا رہا۔

"سید بھائی تم بھی اندر چلو سب مل کر کھانا کھائیں گے۔" حسن نے کہا۔

"نہیں یار، میں تو یہیں بیٹھا ہوں۔"

"سمجھا امی کے ساتھ غیر بنانا چاہتا ہے۔"

"تمہیں تو پتہ ہے۔ امی اس بارے میں بہت سخت ہیں۔ انہوں نے کہہ رکھا ہے کہ کوئی اس عورت سے نہیں ملے گا۔"

"بھائی، ہم کب ملنے جا رہے ہیں۔ ہم تو ابا کے ساتھ کھانا کھائیں گے۔"

وہ کھانا اسی تو تھی جو پہلے بھی ان کے لیے کھانا پکاتی تھی۔ سید کچھ سوچتے ہوئے اٹھا۔

باپ کی دوسری عورت نے سب کو کھانا ڈال کر دیا۔ اس کا آدھا چہرہ آنچل سے ڈھکا ہوا تھا اور وہ خاموشی سے بچوں کو دیکھتی رہی تھی۔

کچھ عرصہ قبل سید کے ابا نے جبل پور میں ایک پرانا مکان خریدا تھا۔ دو سو سال پرانا یہ گھر ایک چھوٹے قلعے کی مانند تھا جس کی دیواروں کی چوڑائی ڈیڑھ گز تھی۔ اس کا بارونق لمبا داخلی دروازہ کھولنے کے لیے دو آدمیوں کو دھکا لگانا پڑتا تھا۔ مکان کے بادلی حصے کی دیواروں میں چار انچ چوڑی اور ایک فٹ لمبی پٹیاں تھیں جو لڑائی کے دنوں میں مورچے کا کام دیتی تھیں۔

جب سید کی اماں نے اپنے شوہر کو دو ٹوک کہہ دیا کہ وہ بچوں کے ساتھ علیحدہ رہیں گی تو رشی حیدر نے فیصلہ کیا کہ انہیں جبل پور کے مکان میں شفٹ کر دیا جائے۔ برسوں تک خالی رہنے کی وجہ سے آس پاس کے لوگ اسے بھوتوں کا بسیرا کہتے تھے۔ سید کو اپنے اس نئے گھر کی کھنکھی بہت دلچسپ لگتی تھی۔ جبل پور دہ کے فطری مناظر، جنگلات، ندیوں اور آبشاروں کی قدرت سے لتھڑا تھا۔ نرمدا دریا کے کنارے پر واقع یہ شہر سیاسی سرگرمیوں کا گڑھ تھا۔

سید چھت پر کھڑا سامنے سے جوق در جوق گزرنے والے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ کالج میں کوئی کہہ رہا تھا کہ آج گوار گھاٹ پر کوئی جلسہ ہونے والا ہے۔

''سید'' پیچھے سے اماں کی آواز آئی۔ سید تیز قدموں کی طرف لپکا۔ اماں کہہ رہی تھیں۔ گاندھی کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ شہر میں فساد کا خدشہ ہے۔ تم بازار سے کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے آؤ۔ سنا ہے کل شاید کرفیو لگا دیا جائے گا۔

جب سے رشنا بمبئی گیا تھا باہر سے سودا سلف لانے کی ذمہ داری سید پر تھی۔ گھر میں تین ملازم تھے۔ لیکن اماں کو ان کی لائی ہوئی چیزیں، خصوصاً سبزیاں پسند نہیں آتی تھیں۔

''سید بیٹا، دو مرغیاں بھی لے آنا اور دیکھو پیسے سامنے گنوا کر دلوانا۔'' ماں کو یقین تھا کہ سید بھاؤ تاؤ میں بہت اچھا ہے۔ پھر بھی تاکید کر رہی تھیں۔ سید سر ہلاتا ہوا اندر ہی اندر بڑبڑا رہا تھا۔ ''اماں کو حالات نے کتنا سخت کر دیا ہے۔ کبھی کسی اور پر بھی اعتبار کر لینا چاہیے۔ مگر انہیں یہ کون بتائے۔ ان کا کہا پتھر پر لکیر کے موافق ہوتا ہے۔ سختی ہی نہیں ہیں کہ ذرا سی نرم ہو جائیں تو بھی کام چلتے رہیں گے۔''

گاندھی کی گرفتاری پر جبل پور میں امن و امان کی خاطر کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ اسکول کالج بند ہونے پر بچے گھر میں بند ہو گئے تھے۔ سید کو گھر میں بیٹھ کر بہت کوفت ہوتی تھی۔

حالات سنبھلنے پر وہ اپنے کالج گیا لیکن کلاس میں جانے کے بجائے باہر ایک درخت کے نیچے بیٹھا اپنے آپ میں الجھا رہا کہ دیپک کی آواز آئی۔ دیپک اس کا کلاس فیلو اور دوست تھا۔

''ارے علی امام تم یہاں بیٹھے ہو آج زوالوجی کا پریکٹیکل تھا۔ سر نے ایک موٹے مینڈک کا ڈائسیکشن کیا تھا۔ بڑا مزہ آیا۔''

"نہیں دیپک مجھے پریکٹیکل کے لیے نہیں جانا تھا۔ مجھے یہ چیز بالکل پسند نہیں۔ بلکہ میں سائنس ہی نہیں پڑھنا چاہتا۔ یہ اپنے بس کی بات نہیں ہے۔"

"لیکن تم نے تو میٹرک بھی سائنس کے مضمون میں پاس کیا ہے۔ تم خود ہی بتا رہے تھے کہ تمہارے نمبر بہت اچھے تھے۔ اسی لیے تو اس کالج میں داخلہ مل گیا۔ ورنہ راونشن کالج میں داخلہ ملنا بہت مشکل ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے یار۔ لیکن میرا من اس میں نہیں لگتا۔ سوچتا ہوں اگلی بار ابا آئیں تو ان سے بات کروں گا۔ میں بمبئی جا کر فائن آرٹس پڑھنا چاہتا ہوں۔ وہاں میرے بڑے بھائی بھی ہیں۔ شاید وہ مان جائیں۔ خیر چھوڑو۔ دیکھا جائے گا۔"

"اچھا تو پھر چلو ٹک شاپ میں چائے پینے چلتے ہیں۔"

ٹک شاپ میں کافی رش تھا۔ سب لوگ گاندھی کی بات کر رہے تھے۔ کچھ زور زور سے بحث کر رہے تھے۔ ہر کوئی گاندھی کی گرفتاری پر غصے میں تھا۔ کسی ایک نے کچھ کہا تو ہاتھا پائی پر نوبت آ گئی۔ ایک طرف سے آواز آئی۔ اہنسا اہنسا۔

علی امام حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ دیپک نے وضاحت کی اہنسا گاندھی کا بنیادی فلسفہ ہے۔ یعنی نان وائلنس۔ لیکن کچھ لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ سبھاش چندر بوس کا بھی یہی کہنا ہے کہ حالات کو درست کرنے کے لیے مسلسل اقدام کی جانب"

"ہاں میں نے بھی پڑھا ہے۔ سبھاش سیکولر ضرور ہے۔ لیکن اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ جمہوریت سے انڈیا کی غربت ختم نہیں ہو سکتی۔ یہ ذرا وضاحت طلب بات ہے۔"

"لیکن ایک بات ہے کہ گاندھی کو بنانے میں انگریز کا بھی بڑا کمال ہے۔ اس نے گاندھی کو قلی کہہ کر اسے انڈیا کا بہت بڑا لیڈر بنا دیا۔"

"وہ کیسے؟"

"یار جنوبی افریقہ میں انگریز ہر ہندوستانی کو قلی کہتا تھا۔"

"اچھا چلو کلاس کا ٹائم ہو گیا ہے۔"

امام نے اپنی چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔ میں بھی آج گھر جلدی جاؤں گا۔

2

یہ ہمیشہ کی طرح ایک روشن دن تھا۔ امام جے جے اسکول آف آرٹس بمبئی کی عمارت کے محرابی دروازوں والے برآمدے میں روشنی اور سایے کے امتزاج کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ جس روز وہ ریل سے وکٹوریہ ٹرمینس پر اترا تھا تو اس کی جیب میں صرف چالیس روپے تھے اور سامنے ایک دنیا پھیلی ہوئی تھی۔ اسے پتہ معلوم تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہ سب کیسے ہوگا۔ ایک اجنبی شہر میں بھائی کا سہارا ابھی تھا لیکن وہ اپنا آپ کیسے سنبھال پائے گا۔ یہ سب غیر یقینی تھا۔

اب تک کی زندگی میں بہت آسائش تھی۔ ہر طرح کی سہولت تھی۔ لیکن وہ ان سب کو چھوڑ کر آ گیا تھا اور خود کو آزمائشوں کے سپرد کر دیا تھا۔ سات راستہ کے اس کمرے میں جہاں پہلے سے 17۔18 لوگ رہتے تھے ایک اور فرد کا اضافہ ہو گیا تھا۔ مختلف فیکٹریوں اور دفتروں میں کام کرنے والے مرد جن میں حیدر رضا واحد اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھا۔ اس کمرے میں کوئی فرنیچر نہیں تھا سوائے بیگوں کے۔ کمرے کا ہر مقیم اپنا بیگ رات کو سوتے وقت تکیے کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ کمرے میں گنجائش کم ہونے کی صورت میں باقی ماندہ لوگ بالکونی میں سوتے تھے۔ کمرے کا ماہانہ کرایہ 15 روپے فی کس تھا۔

امام کے لیے زندگی کا یہ کھردرا پہلو خود مختاری کا پہلا تجربہ تھا۔

امام کے ہم کمرہ افراد میں رالف بھی تھا۔ وہ ایک پراسرار اور پر مزاح شخصیت کا مالک تھا۔ باہر جانے سے پہلے وہ گھنٹے تک میک اپ کرتا تھا۔ عام خیال تھا کہ وہ کسی تھیٹر میں کام کرتا ہے لیکن وہ سینما کے ٹکٹ بلیک میں بیچنے کا دھندا کرتا تھا۔

یہ امام کا معمول تھا کہ وہ آرٹس اسکول کی کلاس ختم ہونے کے بعد پہلے سے طے شدہ جگہ پر رضا سے ملتا تھا۔ پھر دونوں بھائی کسی ڈھابے میں کھانا کھاتے اور اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے جاتے۔ اس روز کھانے کے بعد وہ دونوں ٹہلتے ہوئے گھر کی طرف رواں تھے۔

"سید، بھلا ابا نے تمھیں بمبئی آنے کی اجازت کیسے دے دی۔ وہ تو تمھیں ڈاکٹر یا سائنس داں بنانا چاہتے تھے۔"

"جی بھائی، میں بھی بات کرتے ہوئے بہت ڈر رہا تھا۔ جب وہ پچھلی بار گھر آئے تو میں نے ہمت کر کے ان سے کہہ دیا

کہ میں سائنس نہیں پڑھنا چاہتا۔ بھائی جان مت پوچھیں کہ اس وقت میری کیا حالت تھی۔ میں نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ جب ابا نے کہا ادھر آؤ تو میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ مگر انہوں نے مجھے گلے لگایا اور کہا کہ تم وہی کرو جس میں تمہاری بہتری ہو۔"

جب وہ دونوں گھر کے قریب پہنچے تو صفائی کرنے والی عورت تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ان کی جانب آتی دکھائی دی۔

"کیا ہوا بائی، پریشان کیوں ہو۔"

"صاب! آپ اندر مت جانا، ادھر پولیس ہے۔ جو آرہا ہے وہ اس کو اریسٹ کر رہی ہے صاب۔"

"پولیس؟ یہاں کیا کر رہی ہے اور یہ اریسٹ ــــــ"

"صاب وہ رالف ہے نا، اس نے ایک عورت کا مرڈر کر دیا ہے۔"

"ارے، یہ تو بہت گڑبڑ ہے۔ اب کیا کریں، کہاں جائیں۔" امام پریشان ہو گیا۔

رضا کچھ سوچنے لگا۔ "ایک ہی طریقہ ہے کہ فلم دیکھنے چلتے ہیں۔"

دونوں بھائی قریبی سینما گھر گئے۔ فلم کے ٹکٹ خریدے۔ رضا اندر جانے کے بجائے رک گیا۔ "بھئی سوچو، فلم کب تک چلے گی اس کے بعد کیا کریں گے۔ ہمیں اس طرح نہیں چھپنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں پولیس اسٹیشن چلنا چاہیے۔"

امام تذبذب میں تھا۔ بھائی ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن اگر انہوں نے ہمیں حوالات میں بند کر دیا تو ــــــ پولیس والوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔"

"چلو" رضا نے امام کو پچکارا۔ دونوں بھائی تھانے پہنچے۔ پولیس کو اپنے بارے میں بتایا۔

امام اور رضا کا حسب نسب اور کام پولیس کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ واپس اپنے ٹھکانے پر آ گئے۔ سب لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ امام اور رضا بالکونی میں جا کر سو رہے۔ لیکن اب وہاں رہنا محال ہو رہا تھا۔ کوئی دوسری صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ معاً امام کا دھیان طفوری کی طرف گیا کہ شاید اس کے وسیلے سے کوئی بہتر جگہ مل سکے۔

رضا اپنی تعلیم مکمل کر کے ایک کمپنی میں ملازم ہو گیا تھا۔ رضا کی تنخواہ 300 روپے ماہوار تھی۔ وہ جو تصاویر بناتا تھا کمپنی اسے فروخت کر دیتی تھی۔ اس سے حاصل ہونے والی رقم پر رضا کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ البتہ جو تصاویر نمائش میں بکتی تھیں اس کی آمدنی رضا کی تھی۔ اس طرح ان کا حلقہ وسیع تھا۔ ایک آرٹسٹ جو ٹاٹا میموریل اسپتال میں ملازم تھا اسے زیادہ مشاہرے پر ملازمت کی پیشکش ہوئی تو اسامی خالی ہو گئی تھی۔ علی امام کو وہاں فوٹو گرافر اور گرافک آرٹسٹ کی ملازمت مل گئی۔ نو آموز تھا۔ تنخواہ کم تھی لیکن روزگار کا وسیلہ بن گیا تھا۔ اس کی اپنی کمائی ذاتی اخراجات پورے کرنے کے لیے کافی تھی۔ لیکن یہ بھی ہوا کہ

پینٹ کی ٹیوب خریدنا ضروری تھا لیکن جیب میں پیسے کم تھے تو وہ دوپہر کا کھانا چھوڑ دیا اور اس کے بجائے رنگ خرید لئے۔

غفور نامی میوریل اسپتال میں ریسپشنسٹ تھا۔ امام جب بھی اس کے قریب سے گزرتا تو وہ خوشدلی سے مسکراتا۔ ایک روز امام نے رک کر اس کی خیریت معلوم کی۔

''سر اس اسپتال میں سب ہندو ہیں۔ میرے علاوہ۔ جب پتہ چلا کہ آپ مسلمان ہیں تو مجھے حوصلہ ہوا۔''

تحریک پاکستان زور پکڑ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہندو مسلم فسادات کا خدشہ بڑھتا جاتا تھا۔ غفور اور امام دوست بن گئے تھے۔ غفور نے بتایا کہ وہ کلیان میں رہتا ہے۔ کلیان بمبئی سے 30 میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ غفور روزانہ ٹرین سے بمبئی آتا تھا۔ ایک روز غفور نے کہا۔

امام بھائی، کلیان میں ہمارے ایک بھائی جان ہیں۔ بمبئی بھر میں ان کا بہت ٹرنک ہے۔ میں نے انھیں آپ اور آپ کے بھائی کے بارے میں بتایا تو وہ بہت متاثر ہوئے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

پھر ایک روز رضا اور علی امام غفور کے ہمراہ بھائی سے ملنے گئے۔ بھائی جان اپنی پورٹریٹ بنوانا چاہتے تھے۔ امام نے ان کی خواہش پر ان کی تصاویر اتاریں اور چند روز میں ان کی پورٹریٹ پہنچانے کا وعدہ کیا۔ امام کو پورٹریٹ کی پینٹنگ بنانے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس نے بھائی جان کی تصویر کو اتار کیا اور فریم شدہ تصویر لے کر ان کے پاس پہنچا۔ بھائی جان اپنی اتنی بڑی تصویر دیکھ کر نہال ہو گئے۔

''واہ صاحبزادے۔ تم بہت اچھے آرٹسٹ ہو۔ یہ بہت خوبصورت پینٹنگ بنائی ہے تم نے۔''

''سر، یہ پینٹنگ نہیں فوٹوگراف ہے۔''

''بالکل، شاباش بہت اچھی پینٹنگ ہے۔''

امام کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ خاموش رہے۔ وہ بھائی جان کو نہیں سمجھا سکتا تھا۔ کہ فوٹوگراف اور پینٹنگ میں کیا فرق ہے۔

بھائی جان کو جب غفور سے پتا چلا کہ امام اور رضا کو رہائش کا مسئلہ درپیش ہے تو انھوں نے جھٹ سے یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ کلیان میں بھائی جان کے پانچ مکان تھے۔ انھوں نے ایک مکان کی چابیاں اپنے آرٹسٹ کے سپرد کر دیں۔ بیڈ روم کا ایک بڑا بنگلہ۔ اب مشکل یہ تھی کہ اس لق و دق رہائش کا وہ کیا کریں۔ دونوں بھائیوں کے پاس ایک ایک بیگ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن سب سے بڑی آسائش یہ تھی کہ انھیں باتھ روم استعمال کرنے کے لیے ہر صبح اپنی باری کے انتظار میں چند درجن مردوں کی قطار میں نہیں لگنا پڑتا تھا۔

کلیان سے ممبئی آنے کے لیے امام کو بس یا ریل لینی پڑتی۔ ریل میں بہت سے لوگ بھی ہوتے جو روزگار کی خاطر ممبئی آتے اور شام کو کام کے بعد کلیان لوٹتے تھے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر امام کو اپنے آنے جانے کا 4-3 گھنٹے کے سفر کی کوفت کچھ ہلکی ہو جاتی تھی۔ کلیان میں رہنا مجبوری تھی۔ رہائشی سہولت بہت نعمت تھی۔ وکٹوریہ ٹرمنس سے تاڑ دیو ریل اسپتال تک کا پیدل کا فاصلہ 20 منٹ کا تھا۔ پھر شام کو بے جے اسکول کی پڑھائی۔ زندگی ناہموار تھی۔

اس روز امام اسکول آنے کے بعد کلاس کے انتظار میں ٹہلتا ہوا دور تک چلا گیا۔ شام کے وقت درختوں کی ٹہنیوں پر پھدکتے کودتے، پرندوں کی چہچہاہٹ لبھا رہی تھی۔ امام کو دھوبی گھاٹ کے شب و روز یاد آنے لگے تھے۔ جہاں سے وہ اب بہت دور نکل آیا تھا۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ ایک قدیم طرز کے بنگلے کے سامنے رک گیا۔ امام کو قدیم فن تعمیر کی باریکیاں اور کاریگروں کی پُر مشقت تخلیقات متاثر کرتی تھیں۔ اسکول کی عمارت میں مقامی فن تعمیر اور کولونیل طرز انداز ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے ہوئے تھے۔ پینٹنگ کی پہلی کلاس میں پروفیسر بہیرے نے اسکول کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا تھا کہ اسے انگریز کے دور میں ممبئی کے پہلے بیرونیٹ جمشید جی جیجی بھائی نے بنوایا تھا۔ وہ ہندوستان میں فنون لطیفہ اور فن تعمیر کے لیے ایک مستند ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ مشہور شاعر روڈیارڈ کپلنگ اسی اسکول کے ایک بنگلے میں پیدا ہوا تھا۔

امام کے سامنے بنگلے کی ایک عمارت میں نصب کتبہ نظر آیا۔

میرے لیے شہروں کی ماں
کہ میں پیدا ہوا
اس کے در پہ
جنگلوں اور سمندر کے درمیان
جہاں دنیا ختم ہوتی ہے
اور
کشتیاں انتظار کرتی ہیں

روڈیارڈ کپلنگ

یہ تحریر کپلنگ نے ممبئی کے لیے لکھی تھی۔ مگر روڈیارڈ کپلنگ کون تھا۔ امام یہ نہیں جانتا تھا۔

اسے یہ احساس ہوا کہ منظر بدلتا ہے تو منظر کی تکرار کرنے والے نام بھی بدل جاتے ہیں۔ مدھیہ پردیش کے روایتی

ناموں میں رام، ارجن اور دوسرے تاریخی نام اور ان کے کرم، دھرم اہم تھے۔ جبل پور میں گاندھی اور سبھاش چندر بوس کے نام سنائی دیتے تھے اور اب یہ کیپٹنگ، بحالی بیان

چند روز قبل پروفیسر ہیر نے امام کے اسکیچ کو ہاتھ میں لے کر کہا کہ تم مجھے کلاس کے بعد ملنا۔ امام پریشان ہوا کہ اس سے کیا غلطی سرزد ہوئی۔ وہ پروفیسر کے کمرے میں گیا۔

"جی سر، آپ نے بلایا تھا۔"

"ہاں، بیٹھو۔"

"شکریہ سر۔"

"تم کہاں سے آئے ہو۔"

امام نے اپنے بارے میں بتایا۔

"تم آرٹسٹ بننا چاہتے ہو؟ لیکن تم صرف میٹرک پاس ہو، آرٹسٹ بننے کے لیے تعلیم ضروری ہے۔"

"جی سر، میں اس لیے تو اس اسکول میں پڑھ رہا ہوں۔"

"تم سمجھے نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے تعلیم اور تربیت دونوں مل کر کام کرتے ہیں۔ تعلیم ذہن کو وسیع کرتی ہے اور تربیت خیال کو پراثر طور پر کینوس تک لانے میں مدد دے گی۔"

"امام کنفیوز تھا۔"

"ایک اچھا آرٹسٹ بننے کے لیے فنون کی دیگر جہتوں کو اپنانا ضروری ہے۔ تمھیں لٹریچر پر عبور حاصل ہونا چاہیے۔ موسیقی سمجھ میں آنی چاہیے۔ تھیٹر اور دیگر پرفارمنگ آرٹس مثلاً رقص میں دلچسپی ضروری ہے۔ صرف خاکے بنانے اور ان میں رنگ بھرنے سے کوئی مصور نہیں بن سکتا۔"

امام پروفیسر ہیر کی مشکل باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنے ذہن میں روزمرہ معمولات دہرانے لگا۔ سردست اس میں میٹرک سے آگے پڑھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ تو اتوار کی چھٹی بھی آرٹس کلب میں گزارتا تھا۔

کلیان سے بمبئی آتے ہوئے وہ اپنا سفر کمیونسٹ پارٹی کے اخبار پیپلز وائس پڑھتے ہوئے گزارتا تھا۔ جب وہ ٹرین کی کھڑکی سے باہر دیکھتا تو اسے اس علاقے کے غریبوں جہاں اس کا بچپن گزرا تھا اور بمبئی کے غریبوں میں محض شہر اور دیہات کی بودوباش کا فرق نظر آتا تھا۔ وہاں مرد لنگوٹی پہنتے، بمبئی میں پتلون یا پاجامہ، دونوں میلے ہوتے تھے۔ وہاں کی عورتوں کے گھاگروں نے یہاں سوتی ساڑھیوں نے لے لی تھی۔ سب جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ سب کے بچوں کے پاؤں ننگے

تھے۔ بیٹ ہو گئے تھے۔ امیروں کے یہاں بھی بنگلے تھے۔ وہاں بھی تھے۔ کمیونسٹ پارٹی اشتراکیت کی بات کرتی تھی۔ بمبئی کی ایک فیکٹری کے مزدوروں نے ہڑتال کی تھی۔ پولیس نے گولی چلا دی۔ حق مانگنا جرم تھا۔ پارٹی کے اخبار میں کوڑے کے ڈھیر سے کاغذ اور کپڑے کی دھجیاں چنتے ہوئے دو بچوں کی تصویر چھپی تھی۔

پروفیسر کی نصیحت تھی۔ اچھا آرٹسٹ بننے کیلیے اپنے گردوپیش سے آگاہ ہونا چاہیے۔

"یار امام تم اس لڑکی کو جانتے ہو۔"

"کونسی؟"

"وہ جو آج کی ماڈل ہے۔"

"کون، وہاں میرا خیال ہے اس نے اپنا نام شنشی بتایا تھا۔"

"اور کیا جانتے ہو۔"

"ایک روز اس نے بتایا تھا کہ وہ مہاراشٹر کے ایک امیر آدمی کی بیٹی ہے۔ وہ کسی اسکول میں آرٹ ٹیچر ہے۔"

"اور کچھ۔"

"یار کام کرنے دے نا۔" امام نے ایزل پر لگے کینوس پر سے اپنا ہاتھ روک کر متو پر کو ڈانٹ دیا۔

جس روز امام اور رضا کو یہ پتہ چلا کہ روالف نے قتل نہیں کیا تھا۔ وہ شخص دلال تھا کسی نے اسے خوا تو اہ پھنسا دیا تھا تو وہ بھائی جان کا پرتعیش بنگلہ چھوڑ کر واپس رالف والے گھر میں آ گئے تھے۔ کلیان آنے جانے کے وقت کی بچت کے علاوہ بھائی جان کی احسان مندی سے نجات مل گئی تھی۔ کیونکہ وہاں بہت کچھ پر اسرار تھا۔ ان کی بیٹھک میں اکثر مشکوک قسم کے لوگ نظر آتے تھے۔ لگتا تھا جیسے کلیان بھائی جان کا اڈہ ہے۔ ایک روز وہ تانگے سے آئے تو تانگے والے نے ان سے کرایہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ کہہ رہا تھا ہم بھائی جان کے مہمانوں سے بھاڑا نہیں لیتے۔ خدا جانے غریب کو ان کی کیا مجبوری تھی کہ اپنی مزدوری کا معاوضہ لینے سے انکار کر رہا تھا۔

بمبئی واپس آ جانے کے بعد امام کو پینٹنگ کے لیے خاصا وقت مل جاتا تھا۔ شنشی بھی ہر اتوار کو آرٹ کلب آ کر پینٹنگ کرتی تھی۔ یہ وہاں کا معمول تھا کہ کسی روز اگر کوئی ماڈل نہ آتا تو اسٹوڈنٹس میں سے کوئی ایک ماڈلنگ کرتا اور باقی اس کی اسکیچنگ کرتے تھے۔ شنشی، بڑی بڑی آنکھوں والی، خوش شکل اور خوش اندام ماڈل کو سامنے پا کر سب اپنے اپنے زاویے سے،

اپنے اپنے انداز میں تصویر کشی میں محو تھے۔ سوائے منوہر کے۔ وہ امام کو ڈسٹرب کر رہا تھا۔

"یار تم نے کبھی اسے غور سے دیکھا ہے۔" منوہر ایک بار پھر امام کی محویت میں مخل ہوا تھا۔

"نہیں۔"

"مجھے لگتا ہے وہ تم سے محبت کرتی ہے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔"

"یار وہ تمہیں بہت پیار سے دیکھتی ہے۔"

"دیکھتی ہوگی۔ اس وقت میرے لیے وہ صرف ایک ماڈل ہے۔ جیسے پچھلی بار ہم نے ایک کرسی کو ماڈل بنایا تھا۔ اسے بھی میں پیس آف فرنیچر سمجھتا ہوں۔"

"تم بہت کٹھور آدمی ہو۔ بلکہ روڈ بھی ہو۔"

ششی نے ان کی گفتگو سن لی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتی تھی۔

"او کے۔ اب او ——"

منوہر کو غصہ آ گیا۔ امام نے نظر اٹھائی۔ ششی کی آنکھ سے آنسو نکل کر اس کے رخسار پر آ گیا تھا۔ امام کچھ دیر کو ساکت کھڑا رہا۔ یہ خوبصورت لڑکی اتنے روز سے میرے ساتھ تھی اور میں اس کی موجودگی سے بے خبر رہا۔ برف پگھل گئی تھی۔ امام کا پتھر جیسا دل پگھلا تھا۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر ششی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ منوہر انجان بنا اپنی کینوس پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔

ششی نے امام کی زندگی میں بہت سے دلکش رنگ گھول دیے تھے۔ محبت کے گداز سے ہر واقف شخص اپنے جسم و جان میں کئی طرح کی تبدیلیاں محسوس کرنے لگا تھا۔ جوانی کا وہ البیلا پن، جذبات کی وارفتگی۔ اسے شدت سے اتوار کا انتظار رہتا۔ محبت سے اس کے خطوط میں نئی توانائی اور رنگوں میں شگفتگی عود آئی تھی۔ اس کی تصویر میں میکانی خاصیت کو اختراع اور رنگ آمیزی کے تنوع نے جاذبیت دی تھی۔

اب وہ اپنے آپ سے نکل کر ششی کا ہاتھ تھامے، اس کی باتوں کی نغمگی میں بھیگتا ہوا بمبئی کی کھلی فضا میں آ گیا تھا۔ وہاں وہاں، ہر اس جگہ —— میرین ڈرائیو، انڈیا گیٹ، چوپاٹی، جہاں جہاں محبت کرنے والے نوجوان لڑکے لڑکیاں ساتھ نبھانے کی قسمیں کھاتے ہیں۔ جیون ساتھی کے وعدے کرتے ہیں۔ ہر تفریق کو مٹانے کے دعوے کرتے ہیں۔

ہندوستان میں آرٹ کے بارے میں ششی کی معلومات وسیع تھی۔ وہ گھنٹوں آرٹ کے ماضی اور حال پر گفتگو کرتی اور

امام محبت سے اسے سنتا اور اس کی باتیں اس کے وجود میں سرایت کرتی رہتیں۔

'' چائے یا کافی۔'' امام نے پوچھا۔

'' ہاں میں کافی پیوں گی۔'' وہ کلاس کے بعد ٹہلتے ٹہلتے ایک ریستوران میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔ ششی ساتھ ہوتی تو امام اس کے اسٹیٹس کا لحاظ کرتے ہوئے کسی ستھرے ریستوران میں جاتا ورنہ اس کے لیے کسی کے سڑک کنارے ڈھابے کی لکڑی کی کرسیوں پہ بیٹھ کر کھانا پینا عار نہیں تھا۔

'' تمہیں پتہ ہے بہار کے علاقے میتھلا جو اب مدھوبنی کہلاتا ہے، اس کے دیہاتوں کی عورتیں مندر کی گارے مٹی کی کچی دیواروں پر تصویریں بناتی تھیں۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی۔ جو ان کا عقیدہ تھا۔ چاند اور سورج جو انہیں نظر آتے۔ ان کا ایک پسندیدہ موضوع شیو کا بیاہ تھا۔ جسے وہ پوتر سمجھتی ہیں۔ ان کا اپنا انداز تھا۔ جس سے ان کی بنائی ہوئی تصویروں کی ایک پہچان بن گئی تھی اور وہ مدھوبنی یا میتھلا مصوری کہلانے لگی۔'' ششی کہہ رہی تھی۔

مصوری، مجسمہ سازی اور رقص ہندوستانی زندگی اور طرز زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اور یہ ان کی قدیم تہذیب سے جڑا ہے۔ جب تصویر بنانے کے لیے کاغذ یا کپڑا انہیں ملتا تو وہ غاروں کی دیواریں پینٹ کرتے۔ رنگ نہیں ملتے تو کوئلے، سبزیوں اور معدنیات سے اپنے رنگ تیار کرتے۔ پتھروں کو تراشتے۔

'' دیکھو کبھی موقع ملا تو ہم ایلورا، اجنتا اور کھجراؤ ضرور جائیں گے۔ یہی وہ جگہیں ہیں جہاں ہندوستان کی قدیم روایتی مصوری اور مجسمے ملتے ہیں۔ یہ وہ فن کار تھے جنہیں کوئی نہیں جانتا۔ ان کے نام کسی تصویر یا مجسمے پر نظر نہیں آتے لیکن وہ تھے۔ جن کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔

'' لیکن قدیم فن کار شدید طور پہ حقیقت نگار تھا۔ وہ ایک مخصوص ضابطے کا پابند تھا۔'' امام نے رائے دی۔

'' مائی تھولوجی کی کہانیاں اس نے اپنے ذہن سے بنائی ہیں۔ اسی طرح وہ انسانی خدوخال بناتے ہوئے اپنی آزادی کا استعمال کرتا ہے۔ مثلاً اکثر عورتوں کی آنکھیں بناتے ہوئے پتے کی شکل بنا دیتا ہے۔ یا ناک کو طوطے کی چونچ کی طرح تیکھا کر دیتا ہے۔''

'' اوہو بڑی دیر ہو گئی مجھے اب چلنا چاہیے سنو تم نے کہا تھا کہ میرے گھر چلو گے۔''

'' ہاں کسی روز چلوں گا۔ رضا بھائی انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں نے انہیں تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ تم ان سے ضرور ملنا۔ بڑے اچھے آرٹسٹ ہیں۔''

'' میں نے کبھی انکار نہیں کیا۔ تم خود ہی ٹال دیتے ہو۔''

شتی چلی گئی۔ امام کچھ سوچتے ہوئے گھر کی جانب جارہا تھا۔ شتی کے گھر والے پوچھیں گے کہ یہ لڑکا کون ہے؟ کہے گی۔ میرا کلاس فیلو ہے۔ دوست ہے۔ کیا وہ ان سے یہ کہہ سکے گی کہ یہ مسلمان ہے اور صرف میٹرک تک پڑھا ہے۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ وہ بھی مجھے اتنا ہی چاہتا ہے۔ اس کے بعد ایک طوفان اٹھے گا۔ شاید پھر ہم مل بھی نہ پائیں۔ ان دونوں سے اتنا سا ساتھ اچھا ہے۔ ملتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ ایک دوسرے سے سیکھتے ہیں۔

وہ سب آرٹس کلب کے لان میں جمع تھے۔ شتی بھی آ گئی تھی۔ منو ہر ایزل کے سامنے کھڑا اپنی تصویر کو فائنل ٹچ دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی گروپ میں شامل ہو گیا۔

"یار کل کے لیکچر میں ایک بات کے بارے میں میں کچھ کنفیوز ہوں کہ ہندوستان کا جدید آرٹ اپنے روایتی فن سے جڑا ہوا ہے۔"

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ ہر دور کا فن، وقت اور فضا سے جنم لیتا ہے۔ ہندوستان کے فائن آرٹس میں بھی وقت کے ساتھ تبدیلی آئی ہے اور آتی رہے گی۔ غاروں کی دیواروں پر پینٹ کرنے والوں نے اپنے پیچھے مصوری کی ایک روایت چھوڑی ہے۔ بعد کے مصوروں نے اس روش میں نئے عناصر شامل کئے۔ اس طرح انہوں نے روایت اور جدید جہتوں کو ہم آہنگ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے جدید فن نے ماضی سے حال اور پھر مستقبل کی جانب وہ جدید تبدیلیوں کو شامل کرنے کے لیے ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ اس کا آغاز ری وائیولسٹ آرٹس موومنٹ سے ہوا تھا۔ جن میں رجہ کوی ورما، وویکا نند اور ابندرا ناتھ ٹیگور کے نام آتے ہیں۔

"ابندرا ناتھ ٹیگور یا رابندرا ناتھ ٹیگور؟"

"یار تمہیں بیچ میں بولنے کی عادت ہے۔ پہلے پوری بات تو سن لو۔ رابندرا ناتھ ٹیگور کوی، ناول نگار، افسانہ نگار اور موسیقار کے علاوہ پینٹر بھی تھے۔ لیکن ان کا نام اس گروپ میں نہیں آتا۔ رجہ روی اور وویکا نندا نے دیو مالائی کہانیوں اور دیوؤں کے قصے کو اپنی تصویروں میں پیش کیا۔ جبکہ ابندرا ناتھ ٹیگور نے اپنے فن کو روایتی مغل آرٹ اور قدیم فن مصوری کے ساتھ جوڑا اور اپنی ایک پہچان بنائی۔ لیکن ان تمام مصوروں کی تصویریں السٹریٹو تھیں۔ جبکہ رابندرا ناتھ ٹیگور کے ہاں موضوعات میں اور ان کی پیشکش میں جدت طرازی ہے۔ وہ اپنی کہانیوں، اپنی کویتاؤں کو کبھی اپنے سروں میں سمو دیتے ہیں تو کبھی سروں کو رنگوں کی زبان دے دیتے ہیں۔ مثلاً ان کی تصویر "ڈانسنگ گرل" میں خطوط اور رنگوں کا ربط ہے۔ وہاں حقیقت نگاری نہیں ہے۔"

''ان میں ایک نام بندرے جی کا بھی آتا ہے۔''

''کون؟''

''اندور کے نرائن شریدھر بندرے۔ ان کی ہم ماڈرن لینڈ اسکیپس نے بہت شہرت حاصل کی ہے۔ وہ چند سال قبل مدراس شفٹ ہو گئے تھے۔ وہ تاثر نگاری سے تجریدیت کی طرف بڑھتے ہیں۔ انہوں نے ابندرا ناتھ ٹیگور کی طرح دنیا کے فن مصوری کی نئی جہتوں کو مادہ پرستی ٹھہرا کر رد نہیں کیا۔ ان کے نزدیک فن بندشوں کا متحمل ہو کر مر جاتا ہے۔ اسے زندہ رکھنے کے لیے بڑے دھارے میں شامل کرنا ضروری ہے۔''

وہ ایک خوشگوار شام تھی۔ ششی اور امام کچے ناریل کے میٹھے ٹھنڈے پانی کے مزے لیتے ہوئے سمندر کے کنارے ایک بینچ پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ شفق آسمان سے اتر کر سمندر کے پانی میں گھلتی جا رہی تھی اور لہریں سیاہ، سرخ، سنہری دھاریوں کی صورت میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کروٹیں بدل رہی تھی۔

آرٹس کلب کی اس روز کی گفتگو امام کو بہت اچھی لگی تھی لیکن وہ تب سے بہت مضطرب تھا۔ وہ باتیں اس کے ذہن میں آتے آتے رک جاتی تھیں۔ جیسے وہ ان کو بھرپور طریقے سے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو۔'' ششی نے اس کی خاموشی توڑنے کی کوشش کی۔

''میں دہلی جا رہا ہوں۔''

''کیا؟ ... دہلی کیوں ... کیا بمبئی سے اکتا گئے۔ یا مجھ سے دور بھاگ رہے ہو۔''

''میں نے یہ کب کہا ہے؟ میں تو دہلی اس لیے جا رہا ہوں کہ پھر ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس آ جاؤں۔''

ششی پریشان تھی۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ دیا۔

''دیکھو، میرا یقین کرو، میں نے دہلی میں یوسف بھائی جان سے بات کی ہے۔ وہ میرے بڑے بھائی ہیں اور ایک اخبار کے ایڈیٹر ہیں۔ انہی کا مشورہ ہے کہ میں دہلی میں ان کے پاس رہ کر انٹر کی تیاری کروں۔ اچھی بات تو یہ کہ الٰہ آباد ایجوکیشن بورڈ سے ایک سال میں پرائیوٹ انٹر پاس کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں ایک سال میں انٹر کے نصاب پر عبور حاصل کر لوں گا اور پاس ہو جاؤں گا۔ پھر جیسے حالات ہوں گے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔''

''یہی کہ میں گریجویشن دہلی میں کروں یا بمبئی واپس آ جاؤں۔''

خوشی کے چہرے پر یکا یک غیر یقینی کے سائے چھا جاتے اور وہ اداس دکھائی دینے لگتی۔ پھر حوصلہ کرتی۔ اس نے اپنا ہاتھ امام کے ہاتھ پر رکھا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم جو کہہ رہے ہو وہ سچ ہے۔"

"ایک دوسرے پر بھروسہ اس رشتے کو مضبوط رکھے گا۔" امام نے خوشی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

سورج پوپائی کی عمارتوں کے پیچھے روپوش ہو گیا تھا۔ سمندر میں گھلی ہوئی شفق کی سرخی آہستہ آہستہ کم ہونے لگی تھی۔

وہ دونوں کچھ دور تک ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اگلے موڑ پر اپنے اپنے راستوں پر ہو لیے۔

3

امام کو دلی کی بود و باش، لوگوں کے لباس، لہجے، ان کے چہروں کی رنگتیں، ثقافت، عمارتیں، سب کچھ بمبئی سے مختلف لگ رہا تھا۔ یہاں بہت سے علاقوں کی تہذیبیں ایک دوسرے میں گھلی ملی ہوئیں، کبھی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششیں کرتیں اور کبھی ملاہمت میں ڈھل جاتیں۔ بمبئی میں مدراس، گجرات، دکن کے مختلف رنگ تھے جبکہ دلی، پنجاب، ہریانہ، راجپوتانہ اور اتر پردیش کا تنوع تھا۔

بمبئی سے دلی تک کے طویل سفر کے دوران کسی اسٹیشن پر جب گاڑی رکتی تو امام پلیٹ فارم پر اتر جاتا۔ کچھ کھانے پینے کے لیے لیتا۔ ریل میں اترتے، چڑھتے مسافروں کی عجلت پر حیران ہوتا تھا۔ وہ جو اپنے گھر سے کہیں اور رہنے کے لیے نکلے تھے۔ یا کہیں سے اپنے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے۔ امام کو بھی بمبئی لوٹنے کی جلدی تھی۔ وہ یہی طے کرکے اور اسی عزم کے ساتھ بمبئی سے چلا تھا کہ انٹر کا امتحان دیتے ہی واپس آجائے گا۔ پھر بھی ایک بے چینی اسے دبوچے ہوئے تھی۔ جو یوسف بھائی اور ان کی بیوی کے تپاک سے کچھ سنبھل گئی تھی۔ رالف اور اس کے انواع و اقسام کے ساتھیوں کے ساتھ رہنے کے بعد اسے بھائی کے گھر میں بہت آرام ملا تھا۔ ڈھابے کے کھانے کے بعد بھابی کے ہاتھ کی بگھار لگی دال میں بڑی خوشبو تھی۔ بڑا مزہ تھا۔ یوسف جب اپنے کام پر چلے جاتے تو وہ کبھی بھابی کی فرمائش پر سودا سلف لینے جاتا تو ماں کی ڈانٹ یاد آتی۔

وہ دمدوہ سے چلا تو ناگپور، جبل پور، بمبئی سے ہوتا ہوا دلی تک آگیا تھا۔ سوچتا اب میں اپنے فیصلے خود کروں گا۔ اپنی مرضی کی زندگی گزاروں گا۔ شفی کے حوالے سے، خود کو اس کا ہم مرتبہ بنانے کی خاطر دلی آنے کے موقع کو وہ خوش قسمتی خیال کرتا تھا۔ ورنہ ہندوستان کے اس خطے کی عظیم الشان مغل عمارتوں اور فن لطیف کو قریب سے دیکھنے کا موقع نہ ملتا۔ اس کے لیے جبل پور سے بمبئی آنے پر بڑے شہر کے برتاؤ سے فوری طور پر نباہ کرنا مشکل تھا۔ وہ وہاں عرصہ تک گھبرا گھبرا رہا تھا۔ جب انسیت اور تپاک محسوس ہونے لگا تو وہ اسے چھوڑ کر چلا آیا۔ یہ اچھا کیا یا..... ؟ بہت سے ادھورے سوالات تھے، جن کا فوری جواب کہیں نہیں تھا۔

دہلی آمد کے فوراً بعد امام نے پڑھائی پر بھرپور توجہ دی تا کہ یہاں آنے کے بنیادی مقصد کی تکمیل ہو سکے۔ جب بھی وقت ملتا تو بھائی کے اخبار کے دفتر چلا جاتا۔ سیاسی صورتحال یکدم تبدیل ہو رہی تھی۔ اخبار میں اکثر ایسی خبریں اگلے روز کی سرخیاں بنتی تھیں جن میں ہندوستان کی تقسیم کا ذکر ہوتا۔ دہلی کے بیشتر مسلمانوں کو بہت حد تک اس کا یقین ہو چکا تھا کہ انہیں ایک نہ ایک روز یہاں سے کوچ کرنا ہوگا۔ انہیں پاکستان جا کر ہی عافیت مل پائے گی۔ لیکن بہت سے ایسے بھی تھے کہ بھلے سے ہندوستان بٹ جائے اور پاکستان بن جائے وہ اپنی جگہ نہیں چھوڑیں گے۔ ان میں سے کون درست تھا۔ یہ خود ان کو بھی معلوم نہیں تھا۔ یوسف رضا کے بہت سے عزیز کراچی جا چکے تھے لیکن ان کا ارادہ دہلی میں ہی باقی کی زندگی بسر کرنے کا تھا۔ امام کی بھابی امید سے تھیں ان کے ہاں پہلے بچے کی ولادت جلد ہی متوقع تھی۔ یوسف اس لیے بھی گومگو کی کیفیت میں تھے کہ وہ اپنی بیوی کی اس حالت میں سفر پر جانے کا خدشہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔

امام کا انٹر کا امتحان ختم ہو چکا تھا۔ وہ اب دہلی کو زیادہ سے زیادہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس دوران اس کی ملاقات روہت اور امجد سے ہوئی تھی۔ امجد دریا گنج میں رہتا تھا۔ وہ دہلی میں ہی پیدا ہوا تھا جبکہ روہت کا تعلق جے پور سے تھا لیکن اس کا خاندان کافی عرصے سے دہلی میں آبسا تھا۔ امجد کا رجحان آرکیٹیکچر کی طرف تھا۔ وہ تعمیرات کی باریکیوں کو سمجھتا تھا۔ روہت کھتری کا بیٹا تھا۔ حالانکہ اس کے مزاج اور رکھ رکھاؤ میں نفاست تھی لیکن کبھی نہ کبھی خود اس کے خون میں رچا بسا کھتری پن جھلکنے لگتا۔ روہت کا باپ شیشے کا کاروبار کرتا تھا جبکہ وہ خود انجینئر بننا چاہتا تھا۔ باپ کا اصرار تھا کہ وہ کاروبار سنبھالے۔ بلکہ اسے یہ ترغیب دی تھی کہ راجستھان میں شیشے کی فیکٹری قائم کر لے۔ راجستھان میں ریت کی دستیابی سے وہاں پر فیکٹری قائم کرنا ایک فائدہ مند کاروبار بن سکتا تھا۔

ایک روز روہت امام کے ہاں آیا تو اس نے کہا دیوالی کے موقع پر مندر کے احاطے میں ایک بڑا میلہ لگنے والا ہے۔ کھانا اسٹال بھی ہوگا۔

"یار امام تم میرے ساتھ چلنا۔ بڑا مزہ آئے گا۔ گرم گرم چنے بھٹورے کھائیں گے اور بہت سی لڑکیاں بھی ہوں گی۔"

امام کسمسا کر رہ گیا۔

"کیوں تمہیں لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔ یار منی بھی آئے گی۔ ہم دونوں اسکول کے زمانے سے ساتھ پڑھے ہیں۔ میں اس سے بہت پیار کرتا ہوں۔ پر وہی ہندو مسلمان کا قضیہ کھڑا ہونے کا ڈر ہے۔ حالانکہ اس کا خاندان یہ طے کر چکا ہے کہ وہ بہرصورت دہلی میں ہی رہیں گے۔ پھر بھی ایک کھٹکا لگا رہتا ہے کہ پتہ نہیں وہ کب یہاں سے چلے جائیں۔"

امام نے روہت کو اپنا راز بتایا کہ وہ کس طرح شفق کو ہمیشہ کے لیے اپنانے کی خاطر دہلی آ گیا تھا اور وہ جلد ہی بمبئی لوٹ

جائے گا۔" "بس اختر کے رزلٹ کا انتظار ہے۔ پھر میں کسی صورت یہاں نہیں رکوں گا۔"

روہت اور امام دیوالی کے میلے کی رونقیں لوٹتے پھرے۔ سلمیٰ سے تعارف ہوا۔ وہ ایک کالج میں فائن آرٹس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ امام کو اس کے ساتھ فوری ذہنی ہم آہنگی محسوس ہوئی۔ میلے میں گھومتے ہوئے وہ ایک اسٹال کے سامنے رک گئے۔ وہاں شیشے پر بنی ہوئی تصویریں تھیں۔ بہت ساری۔ جن کے موضوعات زیادہ تر دیومالائی تھے۔

"ان تصویروں کو بنانے والے ملک کے بہت سے حصوں سے آئے ہیں۔ دراصل مندر ان کی سرپرستی کرتا ہے۔ ان کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی سے مندر کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔"

دہلی میں کرشن دیوتا کی بہت مقبولیت تھی۔ زیادہ تر تصویروں میں رادھا اور کرشن کے مختلف موضوعات تھے۔

"یہ تہذیب کا ارتقا ہے۔" سلمیٰ کہہ رہی تھی۔ "چٹانوں کے پتھروں اور دیواروں کے بعد کاغذ اور کپڑے کے علاوہ شیشے پر تصویریں بنانا مقبول ہو رہا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر شیشے کی سطح پر تصویر کشی پسند نہیں ہے۔ حالانکہ ان میں نفاست اور رنگ کا بہاؤ بہتر ہوتا ہے۔ لیکن کھردری سطح پر فنکار بناتا ہے۔ جس سے تصویر کے تاثر میں گہرائی آتی ہے۔"

"تم کسی روز میرے اپارٹمنٹ آ جانا۔ میں تمھیں اس موضوع پر کچھ کتابیں بتا دوں گی۔ کچھ مواد ہماری لائبریری میں موجود ہے۔"

"ارے تم لوگ یہیں رک گئے۔" روہت نے ان کی گفتگو کا سلسلہ توڑا۔ "چلو وہاں ناٹک ہو رہا ہے اور کچھ پیٹ پوجا کا بندوبست بھی کرتے ہیں۔"

"کلاس پینٹنگز دراصل انگریز کے ساتھ ہندوستان میں آئیں۔" سلمیٰ بتا رہی تھی میلے کی بھیڑ سے بچتے ہوئے روہت، امام اور سلمیٰ کھانے کے اسٹال کی جانب بڑھ رہے تھے۔ "لیکن یہ فن بنیادی طور پر چائنیز ہے۔ اسے مڈل کلاس پینٹنگ بھی کہا جاتا ہے۔ مثلاً جو تصویریں میلے میں لگی ہیں وہ شام تک ختم ہو جائیں گی کیونکہ ان کی قیمت مناسب ہے۔ پھر میلے میں آنے والوں کی عقیدت انہیں حاصل کرنے کی ایک بڑی تحریک ہے۔"

موسم میں ہلکی خنکی تھی۔ بمبئی کے سال بھر تقریباً ایک جیسے موسم میں کئی برس گزارنے کے بعد دہلی کے بدلتے ہوئے موسم امام کو اچھے لگ رہے تھے۔ ہر موسم اپنے مختلف انداز میں اتراتا تھا۔ تینوں اپنا کھانا لے کر گھاس پر آ بیٹھے تھے۔ دہلی کی ایک خوشگوار بات یہ تھی کہ یہاں ہر تہوار سب کا تہوار ہوتا تھا۔ چاہے دیوالی ہو، دسہرہ، ہولی یا عید۔ اس میں ہندو، مسلمان، سکھ سب شامل ہوتے تھے۔ سب مل کر مناتے تھے۔

یوسف رضا کے ہاں بچی کی ولادت ہوئی تھی۔ اس کا نام ناہید رکھا گیا۔ بیوی کی زچگی خیریت سے گزر گئی تو یوسف کو اطمینان ہوا۔ ان کے کئی مسلمان دوست پاکستان کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ اب ان کے لیے یہ فیصلہ قدرے آسان ہو گیا تھا کہ وہ بھی پاکستان چلے جائیں۔ لیکن دہلی اور دیگر شہروں سے واہگہ تک جانے والی ٹرینوں کے جلنے اور قتل و غارت کی خبریں ان کے قدم روکے ہوئے تھیں۔ وہ ایک بار پھر شہر کے ان مسلمان گھرانوں کی طرف دیکھتے جو کسی صورت اپنا گھر بار چھوڑ کر جانے کو تیار نہیں تھے۔

اس سب سے بے نیاز امام کے شب و روز میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ صبح ناشتے کے بعد اپنے دوستوں کے ساتھ طے شدہ پروگرام کے مطابق تیار ہو رہا تھا۔ بھابی بچی کو نہلانے میں لگی تھیں۔ یوسف بھائی چائے کی پیالی سامنے رکھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

"ارے بھئی سید تمہارا انٹر کا رزلٹ آ گیا۔ اپنا رول نمبر بتاؤ۔"

امام لپکا اور اخبار میں اپنا نمبر ڈھونڈنے لگا۔

"ہرا" وہ مارے خوشی کے ناچنے لگا۔ وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گیا تھا۔

"بیگم مٹھائی منگواؤ۔ تمہارا دیور پاس ہو گیا ہے۔"

بھائی جان میں باہر جا رہا ہوں۔ واپسی پر مٹھائی لیتا آؤں گا۔ اس کا ایک مقصد شفیق کو مطلع بھی کرنا تھا کہ اب وہ جلد ہی بمبئی لوٹ آئے گا۔ اس نے شفیق کو لکھا کہ اس نے مغل آرٹ اور آرکیٹیکچر پر خاصا مواد حاصل کر لیا ہے ابھی تھوڑی سی ریسرچ باقی ہے جسے مکمل کرتے ہی وہ بمبئی کے لیے روانہ ہو جائے گا۔

شیشے پر نقش نگاری کا آغاز دراصل یورپ میں ہوا تھا۔ سب سے پہلے رنگ کو برش کی مدد سے شیشے پر لگانے کے بجائے مختلف رنگوں کے تراشیدہ ٹکڑوں کو جوڑ کر تصاویر بنائی جاتی تھیں۔ اسے اسٹینڈ گلاس آرٹ کا نام دیا گیا۔ ہندوستان میں شیشے پر مصوری کا فن چینیوں کے ذریعے آیا۔ جنہوں نے پہلے اس کی تکنیک کو یورپ سے سیکھا اور پھر ہندوستان کا رخ کیا۔ دنیا کے ہر مذہب میں سوائے مسلمانوں کے، مذہبی موضوعات پر مجسمہ سازی اور مصوری کی گئی۔ یورپ اور برطانیہ کے قدیم کلیساؤں میں عیسائی عقیدے کے مطابق عیسیٰ اور مریم کی مختلف شبیہیں ماحول میں تقدس پیدا کرتی ہیں۔ ہندوستان اور جنوب ایشیائی ممالک میں گوتم بدھ کے مجسمے موجود ہیں جو مختلف ادوار میں مختلف مواد کے استعمال سے بنائے گئے۔ وشنو، شیو، کرشن اور بہت سے دیگر دیوتاؤں کے مجسمے ہندوؤں کی عقیدت کا اظہار تھا۔ چینیوں نے ہندومت کی دیومالائی کہانیوں پر تصاویر بنائیں تو وہ زیادہ

کامیاب نہ ہوئے کہ وہ ہندو مائی تھالوجی سے ناواقف تھے۔

امام لائبریری میں بیٹھا نوٹس بنا رہا تھا کہ اس جملے کو پڑھ کر ہاتھ روکا اور کچھ سوچنے لگا۔ اپنے استاد کی بات یاد کرتے ہوئے اس یقین کا اعادہ کیا کہ مصوری محض خط اور رنگ کا شغل نہیں ہے۔ ہر تخلیقی کام میں اس وقت گہرائی اور اثر انگیزی آتی ہے جب اس میں جذبات اور احساس بھی شامل ہو۔

امام کو آج امجد سے ملنا تھا۔ امجد نے اسے چاندنی چوک آنے کو کہا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کے چند دیگر دوست بھی مینا بازار کے آس پاس رہتے ہیں۔ وہ ان سے بھی ملائے گا پھر دونوں کسی ہوٹل میں بیٹھ کر چنے اور رومالی روٹی کھائیں گے جو وہاں کی مخصوص ڈش ہے۔ امام بڑی دیر سے انتظار کر رہا تھا۔ لیکن امجد کہیں دکھائی نہیں دیا۔ جب امام مایوس ہونے لگا تو امجد کی جھلک نظر آئی۔ وہ قریب آیا تو یکدم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے بتایا کہ وہ محمد احمد کے گھر گیا تو اس کی دستک پر ایک شخص باہر آیا۔ اس نے گھر کے باسیوں کے بارے میں معلوم کیا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ہم تو خود یہاں نئے ہیں۔" خدا جانے ان کا کیا بنا وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

دلی بس بس کے اجڑنے اور اجڑ اجڑ کر بسنے والا شہر ایک بار پھر اجڑ رہا تھا اور از سر نو اجنبی لوگوں سے بس رہا تھا۔

امام بھی اداس ہو گیا۔ امجد نے اسے حوصلہ دیا اور کھانا کھانے کے بعد وہ لال قلعہ کی طرف پیدل چل پڑے۔ وہ لاہوری گیٹ سے چھتہ چوک سے گزرتے ہوئے نقار خانے میں آ گئے تھے۔ قلعے کا یہ وہ حصہ تھا جہاں کبھی موسیقی اور رقص کی محفلیں سجائی جاتی تھیں۔

پتھر کی ایک چوکی پر بیٹھ کر امام نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ مغل حکمرانوں کے دور میں بننے والی عمارتیں دراصل بہت بڑے پیمانے کی مجسمہ سازی تھی۔ ان کی خواہشوں اور تمناؤں کا اظہار۔ جن میں گنبد، مینار، جھروکے، بالکونیاں، کنگرے اور جالیاں اہم عناصر تھے۔ شاہجہاں نے تاج محل کی تعمیر سے قبل اپنی محبوب بیوی کے لیے قلعے میں ممتاز محل تعمیر کیا تھا۔

امجد اور امام ٹہلتے ہوئے اورنگ زیب کی موتی مسجد کے عقب میں ظفر محل کی جانب آ گئے تھے۔ ہندوستان کے آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر کی نشانی۔ کبھی اس پتھر سے پویلین کو پانی گھیرے رہتا تھا یہاں تک آنے اور جانے سے منتقل کیے جاتے تھے۔ مہمانوں کو پویلین تک لے جانے کے لیے کشتی استعمال کی جاتی تھی۔ وہ پانی خشک ہو چکا تھا۔

امام کے گھر میں عجب طرح کی خاموشی چھائی رہتی تھی۔ وہ شام کو دیر سے گھر آتا اور صبح سویرے نکل کھڑا ہوتا۔ اسے

حالات کے بگڑنے کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ اس مصوری دور میں زیادہ سے زیادہ کام کرنا چاہتا تھا۔ اسے یہاں پر کچھ ایسی کتابیں اور مصوری سے متعلق کارآمد مواد مل گیا تھا جو شاید بمبئی میں حاصل کرنا ممکن نہ ہو۔

مغل آرٹ درحقیقت اکبری تخلیق تھی۔ ان کے والد نے بیٹے کے شوق کو دیکھتے ہوئے ایران سے استاد بلائے تھے۔ اس دوران اکبر نے مصوری کے بہت سے ادارے قائم کئے اور ان کی سرپرستی کی۔ شروع شروع میں اس آرٹ کو انڈو ایران اسٹائل کہا جاتا تھا۔ اکبر نے ہندو مائی تھولوجی کی شاہکار رامائن اور مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کروایا اور اس میں السٹریشنز شامل کیں۔ رامائین اور مہابھارت کے واقعات کی خاکہ کشی کرنے والے فن کار زیادہ تر ہندو تھے۔ یہ ان کی مہارت تھی۔ اس لیے انہوں نے بہت انہاک سے یہ کام کیا۔ ان تصاویر کی تیاری میں زیادہ تر معدنی اور کچھ حد تک نباتات سے اخذ کئے ہوئے رنگ استعمال کئے گئے تھے۔ اکبر کے دور میں پورٹریٹس پر زیادہ فوکس تھا۔ ابتدا میں ہندوستان کے روایتی فن میں مغلوں کی مداخلت کو پسند نہیں کیا گیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ روایت اور جدت کی آمیزش کے نتائج خوشگوار ہونے لگے تھے۔ مغل حکمران قدامت پسند نہیں تھے، نہ ہی ان میں مذہبی تعصب تھا۔ وہ سیکولر تھے اس لیے مصوری کے موضوعات میں نمایاں تبدیلی آئی۔ مغل آرٹ میں رنگ گہرے نہیں تھے۔ خط میں نفاست اور بہاؤ تھا۔ جہانگیر نے مصوری کی روایت کو برقرار رکھا لیکن اب پورٹریٹس کے بجائے واقعات کی عکاسی ہونے لگی تھی۔ جہانگیر کو تعمیرات میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی، سوائے اس کے اس زمانے میں سرخ ریتیلے پتھر کے بجائے تعمیرات میں سنگ مرمر استعمال ہونے لگا تھا۔

امام حسب معمول دیر سے گھر لوٹا تھا۔ صبح اٹھا تو یوسف بھائی جا چکے تھے۔

''بھابی، یہ بھائی جان آج سویرے ہی نکل گئے؟''

بھائی کا موڈ اچھا نہیں تھا۔ امام نے اپنا جملہ دہرایا۔

''ہاں، وہ بہت دن سے پاکستان جانے والی ریل کے ٹکٹ کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن رش بہت ہے۔ وہ اس لیے جلدی نکلے ہیں کہ شاید کام بن جائے۔

امام نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا نہ ہی حیرت کا اظہار کیا کہ اس کا اپنا پروگرام پہلے سے طے شدہ تھا۔ وہ ناشتہ کر کے باہر جاتے ہوئے بھابی کو کہہ گیا کہ میں آج شام جلد لوٹنے کی کوشش کروں گا۔

لائبریرین جانتی تھی کہ یہ نوجوان جو روزانہ گھنٹوں کتابیں کھنگالتا رہتا ہے وہ مسلمان ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں افراتفری پھیل چکی تھی۔ مگر یہ شخص، حالات سے بے خبر اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ امام نے مسکراتے ہوئے لائبریرین کو نمستے کیا اور اپنے مخصوص کونے میں جا کر اپنا کام کرنے لگا۔ لیکن وہ آج بہت مضطرب تھا۔ اس کے ذہن میں آنے والے حالات کی گرم ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ وہ کچھ دیر کو کتابیں سامنے رکھ کر کچھ سوچتا۔ پھر نوٹس بنانے لگتا۔

مغلیہ مصوری کی ترویج سے قبل ہی ہندوستان کے مختلف خطوں میں کئی مکاتب فکر تشکیل پا چکے تھے۔ جو اپنے اپنے اسلوب کی بنا پر ایک دوسرے سے مختلف تھے اور ہر ایک کا اپنا مخصوص تشخص تھا۔ جن میں راجپوتانہ، بھاشولی، کانگڑہ اور پہاڑی طرز مصوری نمایاں تھا۔ راجپوتانہ سیاسی طور پر مغل حکمرانوں کے قریب تر تھا۔ مگر راجپوتوں نے اپنے فطری کھرے پن اور انا کو برقرار رکھتے ہوئے مغل طرز مصوری کے اثرات کو اپنانے سے انکار کر دیا اور اپنا روایتی انداز برقرار رکھا۔ حالانکہ راجپوتانہ مکتب مصوری تقریباً اسی دوران معرض وجود میں آیا جب مغل مصوری دریافت کے اولین مراحل میں تھی۔ اس مرحلے میں مغل اسلوب حقیقت نگاری کی طرف مائل تھا جبکہ راجپوتانہ مصوری میں تجریدی عناصر شامل ہونے لگے تھے۔ ان کے رنگ تیز مگر خطوط باریک تھے۔ ان کے موضوعات زیادہ تر بھاگوت پران کے واقعات کی کہانیوں پر مشتمل تھے۔

راجپوتانہ کو پورٹریٹس میں قطعی کوئی دلچسپی نہ تھی اس کے بجائے وہاں درباروں اور شکار کھیلنے کے مناظر ملتے ہیں۔ راجپوت مصوروں کو موسیقی سے بہت دلچسپی تھی ان کی تصویروں میں مختلف راگ تجریدی انداز میں پیش کئے گئے ہیں جبکہ کانگڑہ کا مزاج صوفیانہ ہے۔ کانگڑہ نے مغل اسلوب کو اپنایا اور اعتراف بھی کیا۔ البتہ مصوری کی تکنیک ان کی اپنی تھی۔ انہوں نے مصوری میں لینڈ اسکیپ کی شمولیت سے اپنا منفرد انداز قائم کیا۔ بھاشولی میں رنگ تغزل ہے اور ان کی پیشکش اثر انگیز ہے۔ ہمالیہ کے دامن میں بسنے والے پہاڑیوں نے کچھ بھاشولی سے لیا اور کچھ کانگڑہ سے۔ پہاڑی فن کاروں کی منی ایچرز میں اسٹرینتھ عام ہیں۔ ان دنوں چونکہ مغل حکمرانوں کی وساطت سے فن کاروں کو روزگار ملنا آسان تھا۔ اس لیے بہت سے پہاڑی مصور دہلی منتقل ہو گئے تھے۔

''سید! ارے بھئی آج گھر پر کیسے ہو۔ میں نے بہت روز سے تمہاری شکل نہیں دیکھی۔'' یوسف بھائی نے دوسرے کمرے سے آواز دی۔

''جی بھائی جان، آج کہیں جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔'' امام کمرے میں داخل ہوا۔ ''بھابی بتا رہی تھیں کہ آپ پاکستان

کے لیے ٹرین کے ٹکٹوں کے لیے کوشش کر رہے تھے۔"

"شکر ہے کل ٹکٹ مل گئے تھے لیکن رش اس قدر ہے کہ سفر بہت کٹھن لگ رہا ہے۔"

"یہ اچھا ہوا۔ میں نے سوچا ہے کہ آپ کی روانگی کے فوراً بعد میں بمبئی کے لیے نکل جاؤں گا۔"

"کیا مطلب — تمہاری بھابی نے تمہیں نہیں بتایا کہ تم ہمارے ساتھ ہی جا رہے ہو۔"

"میں!" امام چونکا۔ "میں پاکستان نہیں جا رہا۔"

"میں نے تمہارا ٹکٹ بھی لے لیا ہے۔"

"ٹکٹ تو خیر کسی وقت بھی بک جائے گا۔ اتنے بہت سے لوگ جانا چاہ رہے ہیں۔"

"سیدھے، بے وقوف مت بنو۔ میں تمہیں یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"میں دہلی میں نہیں رہوں گا۔ بلکہ بمبئی چلا جاؤں گا۔ پھر حیدر بھائی بھی وہاں ہیں۔ میں ان کے ساتھ ہی رہوں گا۔"

"فی الحال تو تم پاکستان جا رہے ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ حالات بہتر ہوتے ہی تمہیں واپس بھیج دوں گا۔"

"لیکن بھائی جان —" امام کچھ کہنا چاہتا تھا۔

"مجھے کچھ اور نہیں سننا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ کس طرح کی خبریں آ رہی ہیں۔ وہ لوگ جو برسوں تک ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی تھے اب دشمن بنے ہیں۔"

دہلی ریلوے اسٹیشن — ہر طرف افراتفری تھی۔ ستے ہوئے چہرے۔ خالی آنکھیں۔ جن سے بے بسی، بے چینی ٹپک رہی تھی۔ یوسف کسی گہری سوچ میں ڈوبے تھے۔ بھابی کی آنکھوں کے آنسو ٹپکتے تھے، رکتے تھے۔ وہ اپنی ساڑی کے پلو سے اپنا چہرہ بار بار صاف کرتیں۔ امام نے ایک کریٹی کو ان سے لیا اور اپنے کندھے سے لگا لیا۔

ٹرین پاکستان کے لیے روانہ ہوئی — ڈبے میں صندوق ہی صندوق، گٹھڑیاں ہی گٹھڑیاں۔ سر ہی سر تھے اداس چہرے۔ ایک طرف سے ہچکیاں سنائی دیں۔ ایک دوسرے کو تسلی۔ ایک دوسرے کو حوصلہ دینے کی کوششیں۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ دور سے بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔ آواز آئی۔ لگتا ہے کسی گاؤں کو جلا دیا گیا ہے۔ کس نے، کیوں۔ یہ تو خوشی کا موقع ہے۔ آزادی ملی ہے۔ ہندوستان انگریز سے آزاد ہوا۔ سامراجیت ختم ہوئی۔ مسلمانوں کی اپنے الگ وطن کی تمنا پوری ہوئی۔ ایک آواز سنائی دی تھی۔

ٹرین کسی نامعلوم مقام پر رک گئی تھی۔ ہر ایک کو یہ خوف بھرا یقین تھا کہ گاڑی پر حملہ ہونے والا ہے۔ سب ایک دوسرے

ریل پنجاب میں داخل ہو چکی ہے۔ سب سے
کو بے بسی سے دیکھ رہے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کیا ہوگا۔ ایک اور آواز ——
کسی نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ بچوں کے
اندوہناک واقعات اسی علاقے میں ہوئے ہیں۔ یا اللہ خیر —— یا علی مدد ——
خطرہ ٹل گیا۔ ابھی تو راستہ لمبا ہے —— عورت نے ڈبے
رونے کی آوازیں تیز ہو گئی تھیں۔ ریل کھسکنے لگی۔ یا مولا تیرا شکر ——
گھٹن، آہوں میں جلتی ہوئی سانسیں، پیاسے ہونٹ، صراحی کا پیندا اوپر کی طرف
میں سے کھانا نکال کر اپنی بچی کو دیا۔ حبس ——
سب جاگ رہے تھے جیسے سو جانے میں
تھا۔ اس میں سے دو قطرے پانی ٹپک کر ریل کے میلے فرش میں جذب ہو گئے تھے۔
موت کے قریب آنے کا خوف ہو۔

ریل گاڑی کی رفتار تیز ہو رہی تھی۔ بوڑھی عورت نے لمبی سانس لی۔ جوان لڑکی جو بہت دیر سے اپنے دوپٹے کے پلو کو
انگلیوں پر لپیٹ رہی تھی اس نے جھٹک کر کھولنا شروع کر دیا۔

سویرا آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا تھا۔ پرندے اپنے گھونسلوں سے نکل کر درختوں کی ٹہنیوں پر چہل کود کرنے لگے تھے۔ دور
ایک شخص ہاتھ میں گڑوی لیے اپنی بھینس کو ہانکتا ہوا کھیتوں میں سے گزر رہا تھا۔

پاکستان آ گیا۔ ہم پاکستان کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس نے کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے کہا۔
''کیا واقعی!''

4

گلابی جاڑوں کا بدن سرد ہوتا جا رہا تھا۔ کالج کے لان میں کچھ لڑکے ٹولیوں میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ طلباء طالبات کلاس روم سے نکل کر برآمدے میں کھڑے تھے۔ وہ اگلی کلاس کا انتظار کر رہے تھے۔ امام سب سے الگ تھلگ لان کے ایک کونے میں درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا بیگ اس کے قریب پڑا تھا۔ وہ بڑی دیر سے ایک کتاب کے مطالعے میں منہمک تھا۔ اس نے ورق پلٹا۔ پھر نہ جانے کیا سوچتے ہوئے پچھلے صفحے کو پھر کھولا۔ بیگ میں ہاتھ ڈالا۔ پنسل نکالی اور پھر پڑھنے لگا۔ پنسل سے ایک پیراگراف پر نشان لگایا۔

کچھ فاصلے پر دو تین لڑکے اپنی باتوں میں مصروف تھے کہ ان میں سے ایک نے سوال کیا۔

"سنو، یہ لڑکا جو درخت کے پیچھے بیٹھا ہے، کیا تم اسے جانتے ہو، کون ہے یہ؟"

"ہاں نیا ہے، پناہ گزین ہے۔ سنا ہے دلی سے آیا ہے۔"

"اسمارٹ ہے۔ بات کم کرتا ہے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا ہے۔ اس کا نام علی امام ہے۔ تھرڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ ہے۔ سنا ہے آرٹسٹ ہے۔"

امام ان سے بے خبر پھر سے پہلے والی سطور پڑھنے لگا۔

انگریز نے ہندوستان کو فرسودہ نظام سے نکالا۔ جس سے یہاں کی تہذیب میں تبدیلی آئی۔ پسماندہ ذہنیتوں میں جدت کو اپنانے کی آمادگی نمو پانے لگی۔ انگریز نے ہندوستان کا انفرااسٹرکچر تعمیر کیا۔ جب پیداواری آلات تبدیل ہوتے ہیں تو تہذیب ارتقائی منزلیں طے کرنے لگتی ہے۔ انگریز نے آبپاشی اور مواصلات کا سسٹم بنایا۔ ریلوے اور سڑکیں بنائیں لیکن اسے ہندوستان کے عوام کی بھلائی مقصود نہیں تھی بلکہ ان تمام کاموں میں اس کے سامراجی مقاصد اور مفادات پنہاں تھے۔

کوہ مری کے پہاڑی سلسلے کے دامن میں واقع راولپنڈی پوٹھوہار کے علاقے کا ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ تقسیم کے بعد پاکستان آنے والے مہاجروں کی بڑی تعداد نے کراچی کا رخ کیا تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ نئے ملک کا دارالحکومت تھا اور وہاں

روزگار کے مواقع دوسرے شہروں کی بہ نسبت زیادہ تھے۔ سکھوں نے لاہور میں آباد ہونے کو ترجیح دی۔ جن میں زیادہ تر مشرقی پنجاب کے مختلف علاقوں سے آئے تھے۔ اس طرح وہ ہجرت کے عذاب کے علاوہ زبان اور لہجوں کے تفرق سے نمٹنے سے چھوٹ گئے تھے۔ راولپنڈی میں مہاجروں کا انبوہ کم تھا۔ اس لیے مقامی رنگ ابھی بھی خاصا تیز تھا۔

علی امام نے راولپنڈی آنے کو اس لیے ترجیح دی تھی کہ چھوٹا بھائی حسن پہلے سے یہاں تھا۔ جو فلیشمین ہوٹل کے نزدیک ایک اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ اس طرح رہائش کا مسئلہ فوری طور پر حل ہو گیا تھا۔

"سید بھائی آپ سے پہلے ایک خط یہاں پہنچ گیا تھا۔"

"ارے!"

"آج کل ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کی آمد ورفت مشکل ہے۔ شاید کسی نے یہ لفافہ بھجوایا ہو۔ کیونکہ اس پر پاکستان کے پوسٹ آفس کی مہر لگی ہوئی ہے۔ یہ لفافہ میں کہیں رکھ کر بھول گیا تھا۔ اس لیے آپ سے ذکر نہیں کیا۔ آج یہ اچانک مل گیا ہے۔"

"لیکن وہ لفافہ ہے کہاں۔"

امام کا تجسس بڑھ رہا تھا۔ "شاید امجد کا ہو۔ اسے میں نے حسن کا پتہ دیا تھا۔" اس نے سوچا تھا۔

"اوہ۔" لفافہ ہاتھ میں لے کر بے اختیار منہ سے نکلا۔ وہ ششی کی پندرہ سطری تھی۔

چند رہ سطروں کا محبت نامہ۔

عمر بھر انتظار کر سکتی تھی۔ زندگی میں کوئی اور تمہاری جگہ نہیں لے سکتا — مجبوریاں — فاصلے — خاندانی تقاضے سرحدیں —

"پاپا نے میرا رشتہ طے کر دیا ہے اور جلد ہی میری شادی ہونے والی ہے۔"

امام کی پہلی محبت کا باب پلٹ گیا تھا۔ بمبئی واپس لوٹنے کے راستوں پر دھند چھا گئی تھی۔ امام نے ہندوستان واپسی کے ارادے کے ساتھ کئی برس گزارے تھے۔ ایک مضبوط ارادہ ایک جھٹکے سے بلوری ظرف کی طرح فرش پر گر کر کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ اس رات کا تقدیر الجھی ہوئی ٹیڑھی لکیریں بنتی بگڑتی رہیں۔

منظر بدل گیا تھا۔ وقت بدل رہا تھا۔ حالات نے کروٹ لی تھی۔ سامنے ایک لمبا راستہ تھا۔ زندگی کو دینے کے لیے۔ زندگی سے حاصل کرنے کے لیے۔

ششی کا خوبصورت چہرہ، اس کی آنکھوں سے چھلکتی ہوئی محبت، اس کے ساتھ گزارے ہوئے پرتپاک لمحات، فکر کے

چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آپس میں جڑنے لگے۔ یہ کسی تصویر کے پس منظر میں ایک پیکر کا عکس۔ جسے فی الوقت مکمل کرنا ممکن نہیں تھا۔

ایک شام امام کالج سے گھر لوٹا تو حسن باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

"آج کیا ارادے ہیں۔ بہت بن ٹھن رہے ہو۔"

"کچھ نہیں بھائی جان، اپنے ہی دوستوں کے ساتھ باہر جا رہا ہوں۔ آپ بھی چلیں۔"

"کہاں"

"یونہی، موج میلا کرنے" —— "بھائی جان، ایک بات پوچھوں، برا مانیں گے تو نہیں ..."

"اس پوچھنے کی کیا بات ہے۔"

"وہ سیمی بھائی —— کیا آپ نے کبھی سیکس ..."

"نہیں"

"نہیں!!! اچھا میں چلتا ہوں۔ لیکن آپ کسی وقت ڈاکٹر سے چیک اپ ضرور کروالیں۔"

"بدمعاش"

حسن دروازے سے ایک بار پھر پلٹا "آپ بھی چلیں نا۔ قسم سے آپ کے سارے غم بھول جائیں گے۔ آپ کی بھتی والی گرل فرینڈ بھی۔"

"ارے بابا، تم جانتے ہو میری ڈیوٹی کا وقت ہو رہا ہے۔ اچھا، وعدہ رہا۔ ویک اینڈ پر کوئی پروگرام بنائیں گے۔"

امام نے راولپنڈی آ کر اپنی کفالت کے لیے ٹیلی فون آپریٹر کی ملازمت کر لی تھی۔ نائٹ شفٹ کو اس لیے ترجیح دی تھی کہ کالج کی پڑھائی میں خلل نہ پڑے۔

گورڈن کالج شہر کا واحد معیاری کالج تھا۔ جو انگریز کے دور حکومت میں قائم کئے گئے مشنری کالجوں میں سے ایک تھا۔ کو ایجوکیشن ہونے کی وجہ سے ماحول میں کشادگی تھی۔ لڑکے لڑکیاں گھل مل کر رہتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کرتے۔ ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے۔ اسلم اپنے گروپ سے اٹھ کر امام کے پاس آ گیا تھا۔ وہ پاکستان بننے سے پہلے راولپنڈی میں ہی رہتا تھا۔ اس کے خاندان کا تعلق گوجر خان سے تھا اور والد ایم ای ایس (ملٹری انجینئرنگ سروسز) میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔

"یار امام، تم تو نئے آئے ہو اس لیے تمہیں اندازہ نہیں ہوگا کہ کالج کا ماحول دن بدن خراب ہو رہا ہے۔ اب دیکھو نا کالج

میں بڑھوں سے کو ایجوکیشن ہے۔ لیکن جمعیت والوں کو اس میں لڑکیوں کا وجود کھٹکنے لگا ہے۔ سنا ہے وہ ایک تحریک چلا رہے ہیں کہ کالج میں کو ایجوکیشن ختم کی جائے کیوں کہ ایک اسلامی مملکت میں یہ مناسب نہیں ہے۔ دیکھو اگر وہ کامیاب ہو گئے تو لڑکیوں کی پڑھائی کا ہرج ہوگا۔

"میرا خیال ہے ایم ایس ایف (مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن) سے بات کرتے ہیں۔" امام کا مشورہ تھا۔

"کوئی فائدہ نہیں۔ وہ لوگ اپنے مطلب کے پیرے ہیں۔ انہیں اسٹوڈنٹس کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"میری ملاقات پروفیسر خان سے ہوئی ہے۔ وہ پاکستان کیمونسٹ پارٹی کے رکن ہیں۔ ایکدم سیکولر ہیں۔ بلکہ میں ان کے ساتھ ایک اسٹڈی گروپ کی میٹنگ میں بھی گیا تھا۔ وہاں ایک کرسچن لڑکے کا انشو اٹھایا گیا تھا۔ وہ اسی کالج میں پڑھتا ہے۔ جمعیت والے اسے تنگ کر رہے ہیں۔"

"کمال کی بات ہے۔ یہ لوگ خود ایک کرسچن مشنری کالج میں پڑھ رہے ہیں اور انہی کے بچوں کو پریشان کرتے ہیں۔"

"آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ کالج میں کوئی اسٹوڈنٹس یونین نہیں ہے۔ ہمیں سب سے پہلے اس پر کام کرنا چاہیے۔ مسلم اسٹوڈنٹس اور اسلامی جمعیت طلبا کی یونینز در اصل سیاسی تنظیمیں ہیں جو اپنی پارٹیوں کے ایجنڈے پر کام کرتی ہیں۔"

"ہوں۔ ہمیں سب سے پہلے ایک اسٹوڈنٹس یونین بنا کر رجسٹر کروانی چاہیے بلکہ ہماری کوشش ہوگی کہ وہ نیشنل لیول پر کام کرے۔ یہ ایک سیکولر تنظیم ہوگی۔ جس میں ہر عقیدے کے لوگ رکنیت حاصل کریں گے۔"

"لیکن جمعیت پہلے سے یہاں پاؤں جمائے ہوئے ہے۔ اگر ہم الیکشن کرواتے ہیں تو یہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔"

"اس کا انحصار ہمارے سینئر یٹ پر ہے۔ ہمیں بہت محنت کرنی ہوگی۔ دوسروں کو اپنے ساتھ ملانے، ان کے رویے تبدیل کرنے، ان کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ہمارا اپنا ذہن کھلا اور ہماری بات میں وزن ہونا چاہیے۔"

اس گفتگو کے دوران امام اور اسلم کے ارد گرد بہت سے لڑکے لڑکیاں جمع ہو گئے تھے جنہوں نے اپنی حمایت کا یقین دلایا تھا۔

کالج کی اسٹوڈنٹس یونین کے انتخابات میں امام کے گروپ کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی تھی اور اسے بطور جنرل سیکریٹری منتخب کر لیا گیا تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ رجعت پسند قوتوں، تنگ نظری اور متعصبانہ رویوں کی گنجائش گھٹ رہی تھی۔ ایک ترقی پسند جمہوری ملک کے تقاضے اور تھے۔ پروفیسر خان کو امام کی کامیابی پر فخر تھا اور انہوں نے اسے کیمونسٹ پارٹی

کی رکنیت دلا دی تھی۔

کالج کے طلباو طالبات میں ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کی تعداد خاصی ہوگئی تھی لیکن ان کے خاندان ابھی تک آبادکاری کے مسائل سے دوچار تھے۔ اس لیے انہیں کالج کی فیس کی ادائیگی میں مشکلات درپیش تھیں۔ امام خود بھی مہاجر تھا لیکن گزر اوقات کسی نہ کسی طور ہو رہی تھی۔ اسے یہ احساس تھا کہ اسٹوڈنٹس میں بہت سے ایسے ہیں جنہیں پڑھائی جاری رکھنے کے لیے مالی امداد کی ضرورت تھی۔ جمعیت کا مطالبہ تھا کہ مخلوط طرزِ تعلیم کو فوری بند کر دیا جائے۔ امتحانات کی وجہ سے اگر ایسا کرنا ممکن نہیں تو لڑکیوں کی کلاسیں علیحدہ کر دی جائیں اور اگلی ٹرم میں کسی لڑکی کو اس کالج میں داخلہ نہ دیا جائے۔

الیکشن کے بعد یونین کا پہلا جنرل باڈی اجلاس بلانے کا فیصلہ ہوا۔ یونین کونسل نے عین اس وقت فیصلہ کیا کہ اجلاس کی صدارت سید علی امام کریں گے۔

''کیا ہوا۔ تمہارا رنگ کیوں اڑ گیا ہے۔''

''کچھ نہیں یار، بس ایسے ہی۔ بات یہ ہے کہ میں نے آج تک کبھی صدارت نہیں کی پھر یہ کہ...... تمہیں معلوم ہے میری اردو بہت کمزور ہے۔ تم کہو تو میں انگریزی میں تقریر کرلوں۔''

''یہ نہ بھولو کہ انگریز کا دور ختم ہو گیا ہے۔ جیسے بھی سہی...... لیکن تمہیں اردو میں بات کرنی ہوگی۔''

ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اسٹوڈنٹس میں بہت جوش و خروش تھا۔

اجلاس کی ابتدائی کارروائی ختم ہوئی تو صدر محترم کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ امام بہت پر اعتماد لگ رہا تھا۔

''دوستو، ساتھیو، حالیہ انتخابات میں آپ سب کی کوآپریشن کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ کو یہ احساس ہوگا کہ نئے ملک کی سٹیبلیٹی کے لیے ہم سب کو مل کر کام کرنا ہوگا۔ بہت سے پرابلمز ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن آپ کو یہ جان لینا چاہیے کہ نوجوان صحیح راستے پر چل کر فیوچر میں ایک بڑی طاقت بن سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو اپنی کمزوریوں کا علم بھی ہونا چاہیے۔ کچھ کرنے کے ارادے کی باتوں سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم سب کو پریکٹیکل ہونا چاہیے۔''

امام کی اردو انگریزی کی کھچڑی بے اثر نہیں تھی۔ خوب تالیاں بج رہی تھیں۔ امام کی تقریر کے دوران بہت سے ہاتھ کھڑے ہوئے۔ ہر کوئی اپنی بات کہنا چاہتا تھا۔

''سر میں عرض کروں۔'' اس کا جملہ ابھی ادھورا تھا کہ دوسری آواز ''جی میں عرض کروں۔''

امام نے ہاتھ اٹھا کر حاضرین کو خاموش ہونے کے لیے کہا۔

''آپ سے ری کوئیسٹ ہے کہ جب ایک صاحب عرض کر چکیں تو دوسرے صاحب عرض کریں۔''

ہال میں کچھ سر ایک دوسرے کی طرف مڑے۔ کچھ کھسر پھسر ہوئی۔ امام پریشان تھا کہ کیا غلط ہو گیا۔''

اجلاس کے بعد اسلم ہنستا ہوا امام کے پاس آیا۔

''مبارک ہو۔ اجلاس کامیاب رہا۔''

''لیکن تم ہنس کیوں رہے ہو۔''

''کچھ نہیں۔ بس ذرا اردو کا مسئلہ تھا۔'' بعد میں اصل بات امام کی سمجھ میں آ گئی۔

''اوہو، ٹھیک ہے۔ یار یہ ارشاد اور فرمایئے کے الفاظ مجھے نہیں آتے تھے، میرا خیال تھا کہ عرض اور ارشاد کے ایک ہی معنی ہیں۔ چلو اب یاد کر لوں گا۔''

اگلے روز پرنسپل کا اردلی لڑکوں سے پوچھ رہا تھا۔ ''علی امام صاحب کون ہیں۔''

امام برآمدے میں کھڑا تھا۔

''میں ہوں۔''

''چلیے صاحب، آپ کو بڑے صاحب نے بلایا ہے۔''

پرنسپل نے وارننگ دی تھی کہ سیاست سے باز آ جاؤ۔

امام کے ساتھی پریشان تھے۔ پروفیسر خان نے انہیں تسلی دی کہ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دراصل مخالف گروپ نے شکایت کی تھی کہ کالج کا ڈسپلن خراب ہو رہا ہے۔ ویسے بھی تم لوگ امتحانوں کی تیاری کرو۔ امتحان ختم ہونے کے بعد ہم اپنی نئی اسٹریٹجی بنائیں گے۔ چھوٹی موٹی دھمکیوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔''

سیزان نے کہا تھا کہ ''میں نے راہبری کے لیے راستے کے نشان بنا دیے ہیں کہ دوسرے اس پر عمل کریں۔''

فرانس کا تاثر نگار مصور پال سیزان جنوبی فرانس میں پیدا ہوا۔ اس کے فن نے پیرس میں نمو پائی۔ ابتدا میں اس کا انداز طوفانی تھا۔ لیکن وہ جلد ہی اس دور سے باہر آ گیا اور جنوبی فرانس لوٹ گیا کہ وہاں کی پرسکون فضا اسے راس آئی تھی۔

امام کے امتحانات ختم ہو گئے تھے۔ اس لیے وہ اپنا زیادہ تر وقت پینٹنگ کرنے میں گزارتا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر سیزان کا پیروکار تھا۔ سیزان کے ہاں رومان پروری تھی۔ جبکہ امام اس کے خطوط پر چلتے ہوئے حقیقت پسند تھا کہ برسوں کی تگ و دو

نے امام کو زندگی کے حقائق کے قریب کر دیا تھا۔

امام نے امتیازی نمبروں میں گریجویشن کیا تو انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کی خواہش کی تکمیل واضح نظر آنے لگی۔ وہ ایک کل وقتی پینٹر بننے سے پہلے تعلیم مکمل کرنا چاہتا تھا۔

انٹرویو کی کال آئی۔

پرنسپل امام کو اپنے سامنے پا کر مسکرایا۔تم بہت اچھے اسٹوڈنٹ ہو۔تمہیں بی اے میں کامیابی حاصل کرنے کی مبارکباد دیتا ہوں۔

''تھینک یو سر۔''

امام کا داخلہ فارم پرنسپل کے سامنے میز پر رکھا تھا۔

''تمہیں صرف اس شرط پر ایم اے میں داخلہ مل سکتا ہے کہ تم آئندہ اسٹوڈنٹس پولیٹکس نہیں کرو گے۔''

''جی سر، وہ اسٹوڈنٹس کے مسائل۔''

''سب ٹھیک ہے لیکن کالج کا ڈسپلن اس سے زیادہ اہم ہے۔''

''لیکن سر، پولیٹکس تو ہر شخص کا حق ہے۔''

''آئی ایم سوری، مسٹر امام۔آپ کو میرے کالج میں ایم اے میں داخلہ نہیں مل سکتا۔کہیں اور ٹرائی کر لو۔''

امام اپنی سیٹ سے اٹھا۔''تھینک یو سر۔'' اور باہر نکل آیا۔دو قدم آگے بڑھا تو کھٹ کی آواز آئی......دروازہ بند ہوا تھا۔

سیزان کی تصویر: ''پھانسی دیئے گئے شخص کا گھر''

ڈھلوانی چھتوں والے مکانوں اور کھپریل سے ڈھکی ہوئی جھونپڑی کے درمیان ایک ایستادہ مستطیل عمارت۔دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ گیا ہے۔ڈھانچے میں دراڑیں پڑ گئی ہیں۔دروازہ بند ہے۔ایک ٹنڈ منڈ درخت کی ٹہنیاں کنکریٹ کی تعمیر پر چھدرا سایہ ڈال رہی ہیں۔لیکن زمین کی گھاس سبز ہے۔نیچے، نشیب میں پانی رواں ہے۔آسمان صاف ہے۔اس کی نیلاہٹ دور تک پھیلتی گئی ہے۔دھرتی پر سائبان کی مانند۔

حسن کو کویت میں اچھی ملازمت مل گئی تھی۔اس کے جانے کے بعد گھر خالی خالی اور بے آواز ہو گیا تھا۔امام ان لوگوں

کے درمیان جا بیٹھا جن کی آواز کوئی نہیں سنتا تھا۔

پارٹی کا مدعا تھا کہ اقتدار کے ایوانوں تک نچلے طبقے کے کاریگروں اور مزدوروں کے مسائل پہنچائے جائیں۔ خصوصاً سرحد پار سے ہجرت کر کے آنے والوں کو رہائش اور معاش کے بے شمار مسائل درپیش تھے۔ اجلاس میں یہ طے پایا کہ مختلف اداروں کی ورکرز یونینز اور کسانوں کی تنظیموں کے ساتھ مل کر کمیٹیاں تشکیل دی جائیں تا کہ نچلے طبقے کے کارکنوں کے مسائل معلوم کئے جاسکیں۔ ملک میں ابھی تک کوئی آئین نہیں تھا۔ نئی حکومت کی پالیسی واضح نہیں تھی۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ پارٹی کی سرگرمیوں کے بارے میں باقاعدگی سے ایک لیف لیٹ شائع کیا جائے تا کہ کارکنوں کو صورت حال سے باخبر رکھا جا سکے۔ راولپنڈی اور اس کے گردونواح میں کوئی انڈسٹری نہیں تھی۔ سوائے مری بروری اور اٹک آئل ریفائنری کے۔ جن کے کارکنوں کی اکثریت کنٹریکٹ پر ملازم تھی۔ مالکان کسی ضابطہ کار کے پابند نہیں تھے۔ اس لیے کارکن کم معاوضوں کے علاوہ جاب سیکورٹی سے بھی محروم تھے۔

وزیراعظم لیاقت علی خان کا دورۂ امریکہ طے ہو چکا تھا۔ روسی وفد نے اپنا دورۂ پاکستان منسوخ کر دیا تھا۔ پارٹی کا فیصلہ تھا کہ وزیراعظم کے امریکہ کے دورے سے قبل ایک جلسہ کیا جائے اور انہیں عوام کو درپیش مسائل سے آگاہ کیا جائے۔

صبح کے 1-30 کا وقت تھا۔ سی پی کے دفتر کی بتیاں روشن تھیں۔ امام جواب پارٹی کا کل وقتی کارکن تھا بڑے انہماک سے اگلے روز کے جلسے میں کی جانے والی تقریر کی تیاری کر رہا تھا۔

ٹھپ ٹھپ...... بوٹوں کی آواز، مدھم روشنی میں خاکی وردیاں ابھری تھیں...... حکم...... سید علی امام آپ کو شہر کا امن خراب کرنے کی پاداش میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا جاتا ہے۔

شہر کا امن خراب ہو رہا تھا...... راولپنڈی کے شہر میں سرخ دھاریاں دکھائی دینے لگی تھیں۔

رنگوں کی ٹیوب کھول کر، برش سے پیلیٹ کے رنگوں کو مکس کرنے، سفید کاغذ پر احاطۂ نظر میں آنے والی چیزوں کے پرتو بنانے والے ہاتھوں میں لوہے کی بھاری ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔

حوالات۔ جہاں اور بہت سے مجرم تھے۔

پیشی۔ انصاف کے ترازو میں ارتعاش تھا۔

کارروائی جاری تھی۔ گواہ بھی موجود تھے۔ یہ گواہ کہاں سے آئے تھے۔ وہ لائے گئے تھے یا بنائے گئے تھے۔ ملزم کٹہرے میں تھا۔

الزام۔ وہ حکومت کو بدنام کرتا تھا۔ عوام کو حکومت کے خلاف بھڑکانے کے لیے پمفلٹ بانٹے جاتے تھے۔

منصف قائل ہو گیا تھا۔ ملزم کو اڑھائی سال بامشقت سزا سنائی گئی۔ وہ سیاسی مجرم تھا۔ بی کلاس دی گئی۔

امام تھالی ہاتھ میں لیے مجرموں کی قطار میں لگا تھا۔ کھانا لینے کے لیے۔ قطار لمبی تھی۔ ''بھائی صاحب آپ...... '' پیچھے سے آواز آئی۔ '' آپ کو میں نے فیکٹری میں دیکھا تھا۔ آپ کسی میٹنگ کے لیے آئے تھے، آپ یہاں کیسے پہنچ گئے۔''

امام نے سرگوشی میں کہا۔ '' کھانا لے لیں، پھر بتاؤں گا۔''

'' مجھے سپروائزر نے پھنسا دیا۔ جعلسازی کے جھوٹے الزام میں۔ میرے پاس وکیل کرنے کے لیے پیسے نہیں تھے بھائی صاحب۔''

'' میرے پاس بھی پیسے نہیں ہیں۔ پارٹی یہ ذمہ داری اٹھانا چاہتی تھی۔ میں نے منع کر دیا کہ میں اپنا مقدمہ خود لڑوں گا۔ میرا جرم یہ تھا کہ میں مزدوروں اور کسانوں کے بھلے کی بات کرتا تھا۔''

دونوں دھوپ سے بچنے کے لیے درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔

'' قیدی نمبر...... ! کتنے لفافے بنائے۔''

'' گنے نہیں۔ دو سو تو ہوں گے۔''

تم ٹھیک سے کام نہیں کر رہے ہو۔ تمہیں روزانہ 5 سو لفافے بنانے ہیں۔ آئندہ ایسا نہ ہو۔'' وارننگ۔

لفافے بنانے کے لیے جو کاغذ ملتا تھا۔ امام اس میں سے کچھ کاغذ بچا لیتا تھا۔ موقع ملتا تو وہ اس پر تصویریں بنانے لگتا۔

چھ ماہ گزر گئے۔

پارٹی کی طرف سے اپیل دائر کی گئی تھی۔ سیشن کورٹ کے جج نے امام کو رہا کر دیا تھا۔ خبر ملی کہ اس کے کچھ ساتھی گرفتار کر لئے گئے تھے۔ شبہ تھا کہ انہیں مار دیا جائے گا۔ یہ بھی خدشہ تھا کہ اسے کسی اور الزام میں دوبارہ گرفتار کر لیا جائے گا۔

وہ اپنی رہائی کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ کہاں جائے گا، کہاں رہے گا۔ کیا کرے گا۔ سب کچھ بے یقینی تھا۔

پھر بھی کھلی کھلی فضا میں سانس لینا اچھا لگ رہا تھا۔ صورتِ حال ابھی تک گمبھیر تھی۔ نقل وحرکت میں احتیاط ضروری تھی۔ بھیس بدل لیا۔ شلوار قمیص کے اوپر کمبل لپیٹ لیتا، داڑھی بڑھالی تھی کہ وہ عوامی جگہوں پر پہچانے بغیر گھوم پھر سکے۔ خبر تھی۔ لیاقت باغ میں بڑا جلسہ ہو رہا ہے۔ سیاست معمولات زندگی میں رچنے لگی تھی۔ خود کو اس سے الگ کرنا سید کو بہت مشکل لگ رہا تھا۔ وہ پیدل جلسہ گاہ کی طرف جا رہا تھا۔ سامنے سے دو پولیس والوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر الٹے پاؤں بھاگا۔

یہ اس کے اندر کا خوف تھا۔

'' چور، چور۔ پکڑو۔'' پولیس تعاقب کر رہی تھی ایک گلی میں مڑ گیا۔ ایک ریڑھی کے نیچے چھپ گیا۔ پھر بھی پولیس نے

پکڑلیا اور تھانے لے گئے۔ ادھر ادھر فون کئے، پھر چھوڑ دیا۔ انڈر گراؤنڈ جانے میں ہی عافیت تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کسی ایک ٹھکانے پر نہیں رہے گا۔ اسے شہر شہر، گاؤں گاؤں منتقل ہونا پڑے گا۔ اس وقت تک کہ حالات سنبھل نہ جائیں۔

سیزان مشاہدے میں آنے والی چیزوں کی تفصیلات حذف کر دیتا تھا۔ لیکن تصویر کا ہر پرتو اپنی جگہ واضح تھا۔ چاہے وہ کسی درخت کا تنا ہو، کوئی چٹان یا کوئی عمارت۔ اس کی لائن میں قوت تھی۔ اسے سمندر کے پانیوں میں زمینی اشیا کا عکس متاثر نہیں کرتا تھا بلکہ ان کے بجائے نیلا انہیں متوجہ کرتی تھیں۔ بعض اوقات اس کی کینوس کے رنگ امیجز کے اصلی رنگوں سے اس قدر مطابقت رکھتے تھے جیسے انہیں ٹیوب سے نہیں بلکہ اصل سے اٹھایا ہو۔

امام کے سامنے آبادیوں کے مٹیالے رنگ ہوتے تو وہ انہیں لائن کی توانائی سے ابھار دیتا تھا۔ وہ ان جگہوں پر رکتا تھا جہاں انسان بستے تھے۔ جو انہیں امان دیتی تھیں۔ جن کی دیواروں میں ان کے سارے دکھ، ساری خوشیاں اور محرومیاں ایک دوسرے کے ساتھ گزر بسر کرتی تھیں۔

پارٹی میں دائیں بازو کے انٹلیکچوئیل بار بار روس کا حوالہ دیتے۔ امام کو ان سے اختلاف رہتا تھا۔ اسے یہ یقین تھا کہ ہیگل، مارکس، اینگلز، اور لینن کی تھیوریز کو اپنی معلومات کے لیے بغور پڑھنا اور سمجھنا ضروری ہے۔ انہوں نے ''سوشل جنس'' کا فارمولا بتایا ہے۔ لیکن ان کے اقوال کے پر اثر اطلاق کے لیے ہمیں اپنے ملک کے حالات دیکھنے ہوں گے۔ ورنہ خاطر خواہ نتائج اخذ کرنا ممکن نہیں ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ شیر علی ناشتہ لے کر آیا تھا۔ پراٹھا، مکھن اور لسی کا گلاس۔ ''امام بھائی، آپ ناشتہ کریں۔ اماں نے چائے چولہے پر چڑھا دی ہے۔ ابھی لے کر آتا ہوں۔''

امام ان دنوں سرگودھا کے قریب ایک گاؤں میں مقیم تھا۔ شیر علی میٹرک میں پڑھتا تھا۔ کسان کے بیٹے کو مڈل کلاس میں وظیفہ ملا تو سرگودھا کے ہائی اسکول میں داخل ہو گیا۔ وہ جب بھی امام کے قریب بیٹھتا تو کالج کی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کرتا۔ لیکن اسے یہ بھی علم تھا کہ کالج میں پڑھنے کا خرچہ اس کے باپ کے پاس نہیں ہے۔

''بھائی جان، کل آپ کا منی آرڈر آیا تھا۔ پارٹی سے ملک صاحب کا پیغام آیا ہے کہ آپ کو دو چار روز میں گجرات جانا ہوگا۔ وہاں ایک میٹنگ رکھی ہے۔''

''محسن کی طرف سے مالی معاونت حاصل کر کے امام کو حوصلہ ملتا تھا۔ وہ آئے روز تبدیل ہونے والے اپنے میزبانوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ اگر براہِ راست کھانے پینے اور رہائش کی ادائیگی مشکل ہوتی تو وہ کسی اور طریقے سے ایسا کر لیتا تھا۔ اس روز بھی شیر علی کے ہاتھ میں کچھ رقم تھما دی۔

''شہر سے میرے لیے وہ چیزیں اور تیکو کا سامان لے آنا اور اپنے لیے نئے جوتے بھی خرید لینا۔ سنو یہ بات اماں ابا کو بالکل نہ بتانا۔''

شمالی پنجاب کا یہ علاقہ امام کے لیے اجنبی تھا۔ گاؤں میں قیام کے دوران اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ دور تک چلتا چلا جائے۔ وہ کھیتوں میں ہل چلانے والے، فصل کاٹتے ہوئے دہقانوں سے فصلوں کی آبیاری کرتے ہوئے کاشت کاروں کو متجسس نظروں سے دیکھتا۔ اس کی نقل و حرکت محدود تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ مقامی لوگوں میں گھل مل جائے لیکن وہ ایسا نہ کر سکنے کے لیے مجبور تھا۔ جس روز شیر علی گاؤں میں ہوتا تو وہ اسے ساتھ لے کر باہر نکل جاتا۔ گاؤں میں اس کا وہ آخری دن تھا۔ اس نے شیر علی سے کہا کہ وہ دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ رکھ لیتے ہیں۔ نہ جانے واپس لوٹنے میں کتنی دیر ہو جائے۔

دھوپ تیز تھی کہ آنکھیں چندھیانے لگی تھیں۔ اسے کچھ فاصلے پر چند عورتیں کھیتوں میں درانتی سے گھاس کاٹتیں اور کھرپی سے زمین کی گوڈی کرتیں نظر آئیں۔ وہ ان کے قریب جا کر تصویر بنانا چاہتا تھا۔ جو ممکن نہیں تھا۔ وہ گوگاں نہیں تھا جو ٹہٹی کی عورتوں کی تصویر بنانے کے لیے ان کی حمایت حاصل کر لیتا۔

فرانس کا تاثر نگار مصور پال گوگاں کہتا تھا کہ ''فطرت کو کبھی قریب سے پینٹ نہ کرو، آرٹ تجریدیت ہے۔ فطرت سے کھیلو، اس کا تصور کرو اور انجام کار اپنی تخلیق کے بارے میں سوچو۔''

امام نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور کھلیانوں کی جانب چل دیا۔ شیر علی نے تاکید کی کہ پاؤں میں بوٹ پہن لیں۔ راستے میں دھول مٹی بہت ہے۔ ویسے بھی پتھریلی زمین ناہموار ہے۔ سنبھل کر چلنا ہوگا۔

''جب میری کھڑی کی کھڑاویں پتھریلی زمین پر گونجتی ہیں تو مجھے وہ دھیمی، مسحور کن لیکن توانا آواز سنائی دیتی ہے، جسے میں

اپنی مصوری میں تلاش کرتا ہوں۔" گوگاں اپنے موضوع سے برتتے ہوئے اردگرد کی دنیا کی روح سے متاثر ہوتا تھا۔

امام رنگ و نقش کی دنیا کی طرف لوٹنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ جو کچھ کر رہا تھا۔ جن حالات سے دوچار تھا وہ اس کا اپنا انتخاب تھا۔ طبعی نا آسودگی، آنے والے کل کی بے یقینی اور بے ثباتی نے اسے زندگی کے قریب کر دیا تھا۔ حقائق سمجھ میں آنے لگے تھے۔

گوگاں نے لوگوں اور دیہات سے جو اس کے احاطہ نظر میں آئے تھے انوکھے کردار اخذ کیے تھے۔ لیکن ان کا انوکھا پن محض دل پذیر نہیں تھا۔ بلکہ وہاں زندگی کے احساسات کا اظہار تھا، نہ کہ صرف فطرت کی ترجمانی۔

امام نے لفافہ بند کر کے شیر علی کو دیا کہ شہر سے پوسٹ کر دے۔ اس نے حسن کو لکھا تھا گزشتہ برسوں کی نا آسودگی نے اسے پہلے سے زیادہ پرعزم اور مضبوط بنا دیا ہے۔ امید ہے جلد ہی حالات بہتر ہو جائیں گے اور وہ ایک آزاد شخص کی زندگی گزارنے لگے گا۔ اسے یہ بھی باور کروایا کہ اس کی طرف سے آنے والی مالی امداد نے اس کی بہت سی مشکلات دور کیں لیکن وہ بڑا بھائی ہونے کے ناطے اسے زحمت دینے پر شرمسار بھی ہے۔ "میں نے کئی کالجوں اور اسکولوں میں آرٹ ٹیچر کی اسامی کے لیے درخواستیں دے رکھی ہیں۔ امید ہے آزاد ہونے کے فوراً بعد روزگار کا کوئی نہ کوئی وسیلہ بن جائے گا۔

کشمیر پوائنٹ کے جنگلے پر دونوں ہاتھ رکھے امام دور تک دیکھتا چلا گیا۔ پہاڑوں کے جلو میں سرسبز وادی کا حسین منظر۔ اس نے ایک لمبی سانس اندر کی طرف کھینچی۔ کوہساری تازہ ہوا نے اس کے سراپا کو خوشبو اور تازگی سے سرشار کر دیا تھا۔ دو سال کی دربدری سے جو تکان محسوس ہونے لگی تھی وہ مری آ کر لمحہ لمحہ اس طرح گھلتی گئی جیسے بارش میں کچے رنگ۔ گھوڑا گلی کے کالج میں خوشحال خاندانوں کے بچے پڑھتے تھے۔ موہنی صورتوں والے ان بچوں کی اجلی یونیفارم دیکھ کر پنجاب کے دیہاتوں میں ننگے پاؤں گرد آلود گلیوں میں کھیلنے والے، کسانوں اور مزدوروں کے بچوں کا خیال اسے بے کل کرتا تھا۔ ڈرائنگ کے سبق لیتے ہوئے دائرے، تکونیں اور مکعبیں بنانے اور خانوں میں رنگ بھرنے کی مشق ان کے لیے محض تربیت کا ایک حصہ تھا۔ ان میں شاید ہی کوئی ایسا طالب علم ہوگا جو مستقبل میں آرٹسٹ بننے کی خواہش رکھتا ہو۔ یہ بچے یہاں سے فارغ ہوں گے تو برطانیہ یا امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے چلے جائیں گے۔ کوئی سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے ڈپٹی کمشنر یا انتظامیہ کے کسی محکمے میں

ڈائریکٹر یا سیکریٹری بن جائے گا۔

امام کو یہاں معقول مشاہرے پر آرٹ ٹیچر کی ملازمت مل گئی تھی لیکن وہ اس کام سے مطمئن نہیں تھا۔ ویک اینڈ تھا۔ امام کا ارادہ کسی ایسی جگہ بیٹھ کر تصویر بنانے کا تھا جہاں اس مقام کا کردار کھل کر سامنے آ جائے۔ منظر واضح ہو۔

"اے بچہ، ایک کپ چائے لا دو۔" اس نے قریبی چائے خانے کے لڑکے سے کہا۔

"کچھ کھانے کو صاب۔ بسکٹ، باقر خانی۔"

"ہاں بسکٹ لے آؤ۔"

وہ چائے خانے کے باہر لکڑی کے ایک بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔ نظر اٹھائی۔ ایک شخص اونی ٹوپی، خاکی رنگ کے سویٹر پر چیتوں والا مفلر گردن سے لپیٹے سڑک سڑک چائے پی رہا تھا۔ امام نے اچٹتی سی نظر ڈالی اور چائے کے اس پار خشک خوبانی سے لدی ریڑھی کو دیکھنے لگا کہ یہاں سے اٹھتے وقت کچھ خوبانیاں خرید لے گا۔ بے دھیانی میں مفلر والے شخص کو دوبارہ دیکھا۔ شکل جانی پہچانی لگی۔ "اسے کہاں دیکھا ہے؟" "وہ میا اکثر سائیکل پر کالج کے سامنے سے گزرتا ہے۔ کون ہے یہ؟ مجھے کیا۔ ہوگا کوئی۔" لیکن اس کا یہاں آنا اتفاق نہیں تھا۔ وہ جو خفیہ ایجنسی کا کارندہ تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن کا تعاقب کر رہا تھا۔ اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا کہ کہیں اس شخص کا نظریاتی اختلاف ملک کی بقا کو خطرے میں نہ ڈال دے۔

اس سب سے بے نیاز امام پینٹنگ کا سامان اٹھائے ایک خوش رنگ عمارت کے سامنے آ بیٹھا تھا۔ مری کے لینڈ اسکیپ میں فطری تنوع تھا۔ بلند پہاڑوں کے جلو میں اصطوانی چھتوں کے درجہ بدرجہ مکان بلندی تک رسائی اور اترنے کے لیے سیڑھیاں اور بل کھاتی ہوئی سڑکیں، مکانوں کے دروازے، کھڑکیاں شاہ بلوط، چلغوزے اور اخروٹ کے درخت، خودرو گھاس اور پودے۔ قرب و جوار کی ان ہیئتوں کا امتزاج اظہار کے لیے اکساتا تھا۔ یہ مناظر ہر زاویے سے مختلف انداز کی کمپوزیشن پیش کرتے تھے۔ انہیں گرفت میں لانا بیک وقت آسان اور مشکل تھا۔ پہاڑی منظر، نیچے سے اوپر تک نشیب سے بلندی تک، وادی سے چوٹی تک، بہت سی سمتیں دکھاتا ہے۔ تصویر کی حدود کسی بھی پہلو سے مقرر کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اپنے اسلوب کے مطابق توازن برقرار رکھنا ذہانت اور وقت کا تقاضا کرتا ہے۔ امام نے مری کے قیام کے دوران بھرپور لینڈ سکیپنگ کی کہ وہ پچھلے برسوں کے دوران سیاست گری کا تاوان تھا۔ اپنی ذات کے ساتھ، جو ڈتھا۔ سیاست کو اپنے آپ سے الگ کرنا امام کے بس میں نہیں تھا لیکن کسی امر کو درست یا غلط ٹھہرانے میں ساتھیوں اور پارٹی کے عہدے داروں سے اختلافات پیدا ہونے لگے تھے۔ امام کو پارٹی کے طریقۂ عمل میں جو سقم نظر آتے وہ انہیں تسلیم نہیں کرتے تھے۔ مصوری میں انہماک ان چھوٹی بڑی رنجشوں

اور تصادم سے فرار بھی تھا۔

امام اپنے فن کے اس مرحلے میں آبی رنگ استعمال کرتا تھا۔ تاثر نگاری مکعبیت کے ساتھ جڑتی جاتی تھی۔ رنگوں کے بہاؤ میں لطافت اور روانی تھی۔ نباتاتی نقوش میں لکیر کے بجائے ہلکے اور گہرے رنگ کے امتزاج سے شبیہ کی وضاحت کی گئی لیکن تعمیراتی امیجز میں لکیر قطعی اور توانا تھی کہ وہی موضوع کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کا آلۂ کار تھا۔ یہی منظر کا تقاضا تھا کہ کہیں خالی سطح نہیں ہے۔ وہاں مختلف رنگوں کے بکھریے روشن ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہوا کہ منظم اور ٹھوس امیجز میں ارتعاش پیدا کیا تو حتمی نقوش ابہام کی لپیٹ میں آ گئے۔ جس سے ایک منفرد تاثر پیدا ہوا اور حقیقت کی جاذبیت میں اضافہ ہوا، جو فنکار کی جولانیٔ طبع کا مظہر تھا۔ جو منظر کی اصل ہیئت کو اپنے مطابق ڈھالتا ہے۔ وہ بگاڑ اس کا اپنا ہے۔ جدت طرازی کی ایک لہک ہے۔

5

لاہور کی فضا میں بہت گداز تھا۔ گو کہ امام نے خود کو مری کے پر فضا فطری مناظر کے سپرد کر دیا تھا۔ لیکن وہ اس کے سحر سے جلد ہی نکل آیا۔ وہ لوگوں کی طرف لوٹ جانا چاہتا تھا۔ جہاں وہ ان کی خوشیوں سے نہال ہو سکے۔ ان کی محرومیوں کے دکھ کو محسوس کر سکے۔ لاہور کی سڑکوں اور گلیوں میں جو آوازیں سنائی دیتی تھیں ان میں کھردرا تپاک تھا۔ سب لوگ ایسے ملتے تھے جیسے وہ ایک دوسرے کے ساتھ کسی نہ کسی ناتے سے جڑے ہوئے ہوں۔

مال روڈ کے کنارے، رکھی بڑی سی توپ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے میو اسکول آف آرٹس کی عمارت پر نظر ڈالی اور اونچے پیڑوں کے نیچے سے ہوتا ہوا ایلجنٹن مارکیٹ سے آگے نکل آیا۔ شام کے پانچ بجے تھے۔ وہ جب سے لاہور آیا تھا پاک ٹی ہاؤس میں روزانہ اپنے نئے دوستوں سے ملنے آتا تھا۔ ان کی محبت اور بے تکلفانہ برتاؤ نے امام کو اپنائیت کا تحفہ دیا تھا۔ جس سے عرصے بعد شناسائی ہوئی تھی۔

حسب معمول لکڑی کی میزوں پر چائے کی پیالیاں کھنک رہی تھیں۔ سگریٹ کا دھواں، بیرے کو آوازیں۔ "آیا صاحب" چائے والے کا ردعمل، خالی پیالیاں اور چمچے۔۔ وہ جو کبھی سفید رہی ہوں گی۔ آ جاؤ یار، چلو وہ کرسی خالی ہو گئی ہے۔ اسے کھینچ لو۔ بن جائے گی جگہ، لو میں ادھر ہو جاتا ہوں۔ شور شرابا، پہلے میری بات سنو، اچھا ہوا آج تم جلدی آ گئے۔ کیوں، وہ وانیہ ہے نا، وہ اپنے ڈپارٹمنٹ میں تصویروں کی نمائش کرنا چاہتی ہیں۔

''ارے کون!!''

''ارے مونیکا احمد، پنجاب یونیورسٹی کے فائن آرٹس ڈپارٹمنٹ میں ہیں۔ کہہ رہی تھیں انھوں نے چغتائی صاحب اور استاد اللہ بخش سے بات کر لی ہے۔ لیکن وہ نئے مصوروں کو بھی اس میں شامل کرنا چاہتی ہیں۔ ویسے بھی انھیں نمائش کے انتظامات کے لیے مدد چاہیے۔''

"برطانوی اینا مونکا، شیخ احمد سے شادی کر کے اینا مونکا احمد ہو گئیں۔ وہ بھی مصور تھے۔ دونوں لندن میں ملے تھے۔ ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ تقسیم سے سات آٹھ سال پہلے پنجاب یونیورسٹی میں فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ کھلا تو اینا اس کی پہلی استاد تھیں۔

"کیا وہ مجھے اپنی شاگردی میں لے لیں گی۔" امام کا سوال۔

"اوہ یہ بھی تو مشکل ہے۔ وہاں صرف لڑکیوں کو داخلہ ملتا ہے۔ انہوں نے مشکل سے ڈیپارٹمنٹ کو بچایا ہے۔ پاکستان بنا تو مسجدوں میں جمعے کے خطبوں میں اینا کا ذکر خیر ہوتا تھا۔ ملا کہتا تھا کہ یہ کافر ہے۔ لڑکیوں کو موسیقی سکھاتی ہے۔ انہیں بت بنانے کے طریقے پڑھاتی ہے۔ بہت ہی جگرے والی عورت ہے۔ ہمت نہیں ہاری۔"

اینا فائن آرٹس کی استاد ہونے کے علاوہ ایک اچھی پینٹر بھی تھی۔ دوسروں کی فرمائش پر تصویریں بناتی اور کبھی جلے دل کے ساتھ کہتی۔ "امیر لوگوں کے لیے خوشنما تصویریں بناتا کہ وہ اپنے گھر سجا سکیں ناپسندیدہ عمل ہے لیکن یہ میرے لیے روزی کا وسیلہ ہے۔ ورنہ ایک فن کار عام لوگوں اور جگہوں پر توجہ دینا پسند کرتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ارد گرد پھیلی ہوئی غربت اور عام لوگوں کو درپیش مسائل کو موضوع بنا کر پینٹ کروں لیکن انہیں کوئی نہیں خریدے گا۔"

14 اگست 1947ء کو پاکستان بنا تو وہ اپنے خاندان کے ساتھ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے مری چلی گئی تھی۔ لوٹی تو لاہور کا نقشہ بدل چکا تھا۔ لوٹ مار، خون خرابہ کرفیو، لاہور دکھی تھا۔ پریشان تھا۔

اینا کے کینوس پر لاتعداد انسانوں کی نقل مکانی کے دکھ ابھرے۔ سیلاب میں بہتی ہوئی لاشیں اس کے اندرون سے اٹھنے والی چیخ کا اظہار بن گئیں۔ اینا خود کو اپنے گردوپیش سے جدا نہیں کر سکتی تھی۔ رنگوں کا باہمی رشتہ مضبوط تھا۔

امام کی اینا سے ملاقات ہوئی اس کی شخصیت میں نظم وضبط کی سختی اور شفقت دونوں گھلی تھیں۔ امام نے گزشتہ برسوں میں بنائی ہوئی اپنی تصویریں انہیں دکھائیں۔

امام کے روشن اور خوش نما رنگ امید اور خوش گمانی سے ابھرے تھے۔ ہیولوں کے خطوط کی نرمی پرسکون تاثر دیتی تھی۔ جیسے لمحے قریب سے سبک روی کے ساتھ تیرتے ہوئے چلے جاتے ہوں۔ ہلکے اور گہرے رنگوں کے امتزاج کی دل پذیری منظر کے سکوت کو توڑتی لیکن وہاں ویرانی نہیں، زندگی کی خاموش نغمگی تھی۔

اینا نے کہا۔ "تم اپنے موجودہ اسلوب کا تسلسل قائم رکھو گے تو تمہاری ایک پہچان بن جائے گی۔"

اینا تو عمر امام کے سچ دو سے متاثر تھی اور اس کی تصاویر کو نمائش میں شامل کرنے کا فیصلہ سناتے ہوئے امام اور اس کے ساتھیوں کو شو کے انتظامات کی ڈیوٹیاں لگا دیں۔

"امام، پریس ریلیز بنانا اور اخبار والوں سے رابطہ اور خبر چھپوانا تمہارا کام ہے۔ کونسی تصاویر کہاں لگائی ہیں۔ یہ ہم سب مل کر کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ نئے آرٹسٹوں کے کام کے لیے الگ حصہ رکھا جائے۔ ایک حصے میں چغتائی، اللہ بخش اور دیگر بڑے مصوروں کو لگا دیں گے۔ اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ وقت کے ساتھ فن مصوری میں کیا تبدیلی آئی ہے۔ اسی سے فن کے ارتقا کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔"

دوستوں کا ٹولہ نمائش کے بعد اپنے کھانے پینے کا انتظام کر کے نہر کے کنارے آ بیٹھا تھا۔

"واہ بھئی واہ، بڑا مزہ آیا، بہت دنوں بعد یہاں تصویری نمائش ہوئی۔ اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر جی بڑا ہوا۔ لاہور پھر سے جاگ رہا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ چغتائی اور استاد اللہ بخش کی تصویروں کے سامنے بہت رش رہا۔"

"ظاہر ہے، وہ بڑے فن کار ہیں۔ دونوں میں شائقین کی توجہ حاصل کرنے اور انہیں محظوظ کرنے کے لیے بہت کچھ ہے۔"

"دیکھو، چغتائی آرٹ سے محظوظ ہونے والے وہ لوگ ہیں جو رنگ و نقش میں طلسماتی انگیزی تلاش کرتے ہیں جبکہ استاد اپنے ماحول سے جڑا ہے اور اسی کی ترجمانی کرتا ہے۔"

امام مشروب کا گلاس تھامے ان کی گفتگو خاموشی سے سن رہا تھا۔ "میں چغتائی صاحب کا مداح ہوں۔ تمہیں یاد ہے جب میں لارنس کالج میں پڑھا رہا تھا تو اپنی تصویروں کی نمائش کرنے یہاں آیا تھا۔ اس میں چغتائی صاحب مہمان خصوصی تھے۔ انہوں نے میری تصاویر کی تعریف کی۔ لیکن جب تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو شروع میں پاکستان میں فن مصوری کے فروغ کی حمایت میں بولتے رہے۔ اس کے بعد ان کا موڈ یکدم تبدیل ہو گیا اور انہوں نے ماڈرن آرٹ کے خلاف کہنا شروع کر دیا کہ یہ سب دھوکہ دہی ہے۔ یہ کوئی آرٹ نہیں ہے۔ میں تو پریشان تھا ہی لیکن تقریب کے حاضرین بھی حیران تھے کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں جبکہ وہ ایک ماڈرن پینٹر کی تصویروں کی نمائش میں اپنی رضامندی سے آئے تھے۔"

عبدالرحمن چغتائی اپنے اسلوب اور رنگ و نقش کی ہم آہنگی، مختلف ہیئتوں کے مابین ربط اور توازن قائم کرنے میں اپنا

ثانی نہیں رکھتے تھے۔ گو کہ وہ مغل، راجستھان اور پہاڑی مکاتب مصوری سے متاثر تھے۔ لیکن ان کا ہر نقش اور رنگوں کی آمیزش ان کا اپنا جوہر تھا۔ چغتائی اپنی مصوری کے اوائل میں ہندو خریداروں کے لیے دیومالائی کرداروں کی شبیہیں بناتے تھے۔ کیونکہ مسلمان تصویریں نہیں خریدتے تھے۔ محمود غزنوی نے شاہنامہ فردوسی کی تمثیلی تصاویر بنوائیں۔ جنہیں آنے والے ادوار میں بار بار بنایا گیا۔ اسی طرح داستان امیر حمزہ کی السٹریشنز ہیں۔ لیکن وہ کتابی سائز کی تصاویر تھیں۔ جنہیں تولیہ میں پیش کیا جاتا تھا۔ ان کی سرعام نمائش ممنوع تھی کہ وہ مذہبی تقاضوں کے برخلاف تھی۔ اس سے منی ایچر تصویروں کی ترویج ہوئی۔ چغتائی کا کنٹری بیوشن یہ ہے کہ وہ اس طرز پر بنائی گئیں تصویروں کو بڑے فریم میں منظر عام پر لائے اس کے ساتھ انہوں نے اپنے پیکروں کو تصویر کے جمالیاتی تقاضوں کے مطابق بڑھایا گھٹایا۔ یہ ان کی اسٹائلائزیشن تھی۔ جس سے تصویر کے تاثر میں جاذبیت اور رنگ تغزل کا اضافہ ہوا۔ ایک اور اہم عنصر یہ کہ ان کے ہاں چہروں کے زیادہ تر پروفائل ہیں اور وہ رنگ آمیزی میں کمال رکھتے ہیں۔ ٹرانسپیرنٹ آبی رنگوں پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ وہ بتدریج گرافکس کی طرف آئے۔ جس سے ان کے فن میں مزید نکھار آتا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک باکمال مصور ہیں۔ لیکن جدید مصوری پر ان کی ظالمانہ تنقید بے جا ہے۔''

''فن کی کوئی بھی صنف ہو اس میں وقت کے ساتھ نئے عناصر اور جزئیات شامل نہ ہوں تو وہ جامد ہو جاتا ہے۔''

''چغتائی صاحب تجریدی آرٹ کو تخریبی آرٹ کہتے ہیں۔ یہ زیادتی ہے۔''

شام ڈھلنے لگی تھی۔ درختوں کی شاخوں پر چڑیوں کا شکوہ تھا۔ وہ اپنی مستی میں ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کرتیں ایک شاخ سے دوسری شاخ پر رقصاں تھیں۔ نہر کا بہاؤ نرم تھا۔ یکدم اس میں ارتعاش پیدا ہوا۔ سفید بطخوں کا جوڑا تیرتا ہوا سامنے سے گزر رہا تھا۔ جانے ان دونوں میں کیا رنجش پیدا ہوئی کہ بڑی بطخ نے پلٹ کر چھوٹی بطخ کی گردن پر غصے سے اپنی چونچ ماری۔

''میں چلتا ہوں۔ استاد اللہ بخش کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں بہت روز سے ان کے ہاں نہیں گیا۔ ورنہ میں اکثر کئی گھنٹے ان سے باتیں کرتے ہوئے گزارتا ہوں۔ بہت نفیس انداز کے آدمی ہیں۔'' صفدر نے کہا

''ارے یار، مجھے بھی ان سے ملنا ہے۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تم ان کے ہاں جاتے ہو۔'' امام نے شکایت کی۔

''چلو آج بتا دیا۔ تم بھی چلو۔ تم سے مل کر خوش ہوں گے۔ وہ نئی نسل کے فن کاروں کی بہت حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔''

''آج مشکل ہے۔ کسی اور روز چلوں گا۔ میرا ایک دوست ہر ہفتے موسیقی کی محفل میں جاتا ہے۔ کہہ رہا تھا میرا منڈی رقص و سرود کی کہکشاں ہے۔''

''تو موسیقی کا پروگرام ہے؟''

"مجھے نہیں معلوم۔ میں پہلے کبھی اس طرف نہیں گیا۔ وہ اصرار کر رہا تھا تو میں تیار ہو گیا۔ تم اگلی بار استاد کے ہاں گئے تو میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہاں، وعدہ رہا، تم استاد سے ضرور ملنا۔"

لاہور کی پیسہ اخبار اسٹریٹ میں رہنے والے اللہ بخش نے بورڈ نویسی کی تربیت حاصل کرنے کے بعد آغا حشر کے تھیٹر کے لیے منظر کشی کی۔ لاہور کی ریلوے ورکشاپ سے لے کر "قحط" اور "پیسہ" تک جو بمبئی کے مزدور کی مشقت کی عکاس تھی، ایک طویل سفر طے کیا۔ ایک روز ایک انگریز کی نظر ان کی ایک تصویر پر پڑی تو اسے آگے بڑھنے کا راستہ بتایا۔ برٹش راج میں مصوروں کو کاریگر قرار دیا جاتا تھا۔ جیسے بڑھئی، لوہار۔ میو اسکول آف آرٹ کے قیام کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ کاریگروں کو تربیت دی جائے۔ اس ادارے میں جدید رجحانات یا تصویر کشی کے قدیم اسلوب اور ثقافتی ورثے پر تعلیم دینا مقصود نہیں تھا۔ بلکہ انڈسٹریل اور کمرشل آرٹ کے کورسز کروائے جاتے تھے۔ انگریز اہل کاروں کی بیویاں، جو اپنے ملک میں گھریلو خدمت گاروں سے ناواقف تھیں، ہندوستان میں ملازموں کی موجودگی نے انہیں بہت سی بوریت سے دوچار کر دیا تھا۔ وہ وقت کاٹنے کے لیے واٹر کلرز سے پینٹنگ کرنے لگیں۔ جن کے پسندیدہ موضوع اس خطے کے غریب کاریگر ہوتے۔ اس طرح "بازار آرٹ" وجود میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی مصوروں کا پیشہ تبدیل ہوا اور وہ روغنی اور نباتاتی رنگوں کے بجائے آبی رنگ استعمال کرنے لگے۔ اس طرح ان کی صنف کے جوہر میں نمایاں فرق نظر آنے لگا۔

استاد اللہ بخش نے آبی رنگوں میں پنجاب کی دیہی زندگی پر بے شمار تصویریں بنائیں۔ ان کے کردار اس سرزمین کی کہانیوں کے علاوہ اپنے ماحول سے نکلے تھے۔ وہاں وہ کچھ تھا، جس میں وہ سانس لیتے تھے۔ وہ لوگ جو ان میں سے تھے۔ ان کے فن نے ارتقائی منازل بتدریج طے کیں اور اس میں تجریدی جزئیات از خود شامل ہوتی گئیں۔

استاد اور چغتائی دونوں پر اعادے کا الزام بھی تھا۔ جس کی مثبت تاویل یہ ہے کہ ہر فن کار کے بنیادی اسلوب اور صنف کے تخلیقی سانچے میں کچھ جزئیات اور ہیئتیں بار بار نمودار ہوتی ہیں لیکن ساتھ ترقی کے مختلف مراحل کے دوران جو کچھ ماضی میں کہا گیا تھا، اس کا اعادہ محض گزشتہ کی واپسی نہیں ہے۔ تخلیقی عمل ایک مرغولے کی مانند ہے جو سطح زمین سے اوپر کی طرف اٹھتا ہے۔ وہ ہر مرحلے میں نئی اشکال نئے انداز سے بناتا ہے۔ یوں سابق میں جدت کے لیے ترمیم اور بہتری از خود آتی جاتی ہے۔ یہی ارتقائی عمل کا مظہر ہے۔

امام لاہور آ کر بہت خوش تھا۔ مرے بعد اسے ایسے دوست مل گئے تھے جو اس کے ہم خیال تھے۔ صفدر، شہزاد، معین بھی، قطب شیخ جدت پسند مصور تھے جو روایتی تکنیک نگاری سے ہٹنا چاہتے تھے۔ یہ سب لوگ اپنے آپ میں گم، لیکن ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ امام کی معین کے ساتھ کافی گاڑھی چھنتی تھی۔ گھومنا پھرنا ہر طرح کی آوارہ گردیاں، لڑکیوں کو پٹانا، انہیں پہاڑوں پر گھمانے لے جانا، پھر ان کی چھٹی کر دینا۔ ایسی تمام حرکتوں میں دونوں ایک دوسرے کے سنگی ساتھی تھے۔

اس روز وہ ٹی ہاؤس سے نکلے تو معین نے کہا، "یار امام، چلو آج لبرٹی روڈ چلتے ہیں۔ وہاں مرغ چھولے کھائیں گے اور کشمیری چائے پئیں گے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔۔ چلو۔"

دونوں چلتے چلتے ہال روڈ کی نکڑ پر پہنچ گئے تھے۔ سینماؤں کا چھ بجے والا شو ختم ہونے والا تھا۔ اگلے شو کے لیے لمبی لائنیں لگی تھیں۔

"تمہاری جیب میں کتنے پیسے ہیں۔"

"کیوں۔"

"میرا خیال ہے لبرٹی روڈ کا پروگرام پھر کسی روز بنائیں گے۔ آج فلم دیکھتے ہیں۔"

"یار ایک پروگرام بناؤ، کبھی کچھ کہتا ہے۔ جب میں ہاں کہہ دیتا ہوں تو نئی اسکیم بنانے لگتا ہے۔ اچھا چل۔"

چلتے چلتے امام کچھ دیر کو رکا۔ معین نے پلٹ کر پوچھا۔ "کیا معاملہ ہے۔"

"کچھ نہیں، میں نے سنا ہے زبیدہ آغا بہت اچھی پینٹر ہے۔ لاہور میں اس کی بہت دھوم ہے۔"

"ہے تو۔"

"کیا اس سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ ہم اسے اپنے گروپ میں شامل کر لیں گے۔"

"گروپ میں تو شامل ہو جائے گی لیکن ملاقات ذرا مشکل ہے۔ میں اسے زیادہ نہیں جانتا۔ وہ صفدر کی دوست ہے۔"

"چلو صفدر کو ساتھ لے لیں گے۔"

"ایک اور مسئلہ ہے کہ تو بہت بولتا ہے جبکہ وہ کم گو ہے۔ اس لیے امکان یہی ہے کہ وہ تم سے یا تم اس سے جلد اکتا جاؤ گے۔"

"تم بھی یار، پتہ نہیں کہاں تک لے گیا بات کو۔ وہ حال ہی میں پیرس سے لوٹی ہے۔ ہم اس سے کچھ سیکھ سکتے ہیں۔"

"چلو، یہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ فلم دیکھیں یا مرغ چھولے کھائیں..."

فی الوقت دونوں کی سمت بے یقینی تھی۔ ابھی اس کا تعین کرنا باقی تھا۔ دونوں اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔

زبیدہ آغا کہتی تھیں چیزوں کو نہیں۔ خیالات کو پینٹ کرو۔

منٹگمری کے خوشحال زمیندار خاندان میں پیدا ہونے والی زبیدہ آغا کو مصوری کے فن کو سنوارنے کے لیے متعدد ترقی کے مواقع ملے، جو عموماً اس نوعیت کے میلان کو عملی صورت دینے کے لیے بہت کم فن کاروں کو نصیب ہوتے ہیں۔ زبیدہ نے مصوری میں روایتی روش سے انحراف برتنے کی جرأت کی۔ انہوں نے اظہار کے لیے اپنی الگ راہ بنائی۔ انسانوں اور چوپایوں کی اشکال اور اعضا کو بطور علامات استعمال کیا۔ کینوس کی تقسیم اور توازن مختلف رنگوں کے امتزاج سے ابھرا۔ گہری نیلاہٹوں کا غبار، چھنتا ہوا دودھیا روشنی میں بدلتا ہے تو کنکریٹ کی شہری عمارتیں فسوں انگیز ہو جاتی ہیں، جیسے تنگ زمین پر ماضی کی یادیں بے بس ہیں لیکن وہاں مایوسی نہیں۔ حیرت ہے اور بلند نظری بھی۔ کبھی کبھار زبیدہ کا اظہار ملفوف ہو جاتا ہے۔ پراسرار، جیسے وہاں خوش امیدی اور انجانے خدشات کے مابین تصادم جاری ہو۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں قریب رہتی ہیں لیکن دور کہیں افق پر اندھیرا چھایا ہے، جیسے ہوا رنگوں کو لے اڑی ہو، پھول پتیوں کی خوشبو کو بھی، جو کبھی نہ کبھی، گہرے سایوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ زبیدہ کے ہاں ٹھہراؤ نہیں، بہاؤ ہے۔ پیانو کے سر ساکت فضا میں تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔ گرد و پیش کا سکوت ٹوٹتا ہے، ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ یکسوئی کا انکار اقرار کے اظہار کے لیے رنگوں اور نقوش کے کئی روپ دھارتا ہے۔

O

ٹرین بہاولپور کے ریلوے اسٹیشن پر رکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی قلیوں نے ڈبے پر دھاوا بول دیا۔ ''جی صاحب، جلدی کریں، یہاں گاڑی تھوڑی دیر کے لیے رکتی ہے۔ آپ کا سامان، جی یہ سوٹ کیس اور بھی ہے۔ اچھا جی، یہ بھی۔'' امام نے قلی کو ہولڈال کی طرف اشارہ کیا۔

ریل گاڑی نے وسل دی۔ گارڈ نے سیٹی بجا کر انجن ڈرائیور کو ہری جھنڈی دکھائی۔ ٹرین چھک چھک کرتی پلیٹ فارم سے باہر نکل گئی۔ آنے والے مسافر باہر نکلنے کے بجائے اپنی گٹھڑیوں، صندوقوں اور پانی کی صراحیوں کو فرش پر رکھے کھڑے تھے۔

''یہ لوگ باہر کیوں نہیں جا رہے؟ کیا یہ کسی کا انتظار کر رہے ہیں؟''

''وہ تو نواب صاحب کی بڑی رانی آئی ہیں۔''

"تو پھر؟"

"وہ جی، جب تک ان کی موٹر روانہ نہیں ہو جاتی، کوئی شخص باہر نہیں جا سکتا۔"

"کیا مطلب؟" قلی کو مطلب معلوم نہیں تھا۔ امام نے اسٹیشن کے باہر نظر دوڑائی۔ ایک شیورلٹ کار کھڑی تھی۔ اس کے شیشوں پر پردے لگے ہوئے تھے۔ اس میں کون تھا، یہ معلوم نہیں۔

ایک بزرگ مسافر امام کے قریب آئے۔ "صاحبزادے تم یہاں پہلی بار آئے ہو۔"

"جی"

"میں نے اپنی تمام عمر یہاں گزاری ہے۔ یہ یہاں کی روایت ہے۔ اب تو حالات بہت بدل گئے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ جب نواب خاندان کی عورتیں آتی تھیں تو ڈولی ریل کے ڈبے کے پاس رکھ دی جاتی تھی اور جب تک وہ ڈولی روانہ نہ ہو جاتی اسٹیشن کے اندر اور باہر سب مرد پیٹھ موڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔"

امام کو یہاں کے ایک اسکول میں ملازمت مل گئی تھی۔ اس علاقے کو قریب سے دیکھنا اور یہاں کی ثقافت کے بارے میں جاننے کا ایک اچھا موقع تھا۔ اسٹیشن پر ملنے والے بزرگ نے امام کا تعارف یہاں کے رسم و رواج سے کروا دیا تھا۔ وہ مضطرب تھا۔ اجنبیت، ریاست والوں کا دبدبہ، غریب رعایا کی بے بسی، گھر کی یاد آوری۔ امام کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لاہور اور دوستوں کی یاد نے آ دبوچا۔ جی چاہا کہ وہ دوسری ٹرین سے واپس چلا جائے۔ ادھر بھی روزگار کا کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جاتا۔ پچھلی نمائش میں کچھ تصویریں بک گئی تھیں۔ گزارہ چل رہا تھا۔

"لیکن نہیں۔ مجھے کچھ عرصہ یہاں ضرور گزارنا ہوگا۔" امام نے خود کو سمجھایا۔

صادق پبلک اسکول کے طلبا اور لارنس کالج کے طلبا میں نمایاں فرق تھا۔ یہ یہاں کا معیاری اسکول تھا لیکن اس میں زیادہ تر بچے اسی علاقے کے تھے۔ زمینداروں اور سرکاری افسروں کی اولادیں۔ یہ ادارہ عام بچوں کی پہنچ میں نہیں تھا۔

امام نئے ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے کمرے میں آ کر لیمپ جلایا۔ گزشتہ چند روز سے کڑاکے دار گرمی پڑ رہی تھی۔ شام کو ذرا دیر آندھی چلی تو اس کے بعد گرمی کی شدت میں کچھ کمی آ گئی تھی۔ امام نے میز پر رکھی ہوئی کتابیں اور کھلے کاغذوں کے مواد کو کھنگالا۔ آرام کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر امرتا شیرگل کے بارے میں پڑھنے لگا۔ معاً اسے خیال آیا کہ ایک شام جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ نیڈرگک کراس سے پیدل چلتے ہوئے فلیٹیز ہوٹل کے سامنے سے گزرے تو معین نے بتایا تھا کہ اس ہوٹل میں امرتا شیرگل بھی رہی تھی۔

امرتا شیرگل جوانی میں مرگئی۔ یہ بھی اس کا کمال تھا۔ بوڑھی ہو کر مرتی تو لوگ اسے اتنا یاد نہ کرتے۔" امام نے سوچا تھا۔

زندگی کے آخری دور میں امرتا اپنے گاؤں سرایا سے لاہور آئی تو اسے یہاں کا ماحول اپنے آبائی گاؤں کے مقابلے میں کھلا کھلا لگا تھا۔ اس کی آمد نے لاہور کے ادبی اور ثقافتی حلقوں میں ہلچل مچا دی تھی۔
ہنگیرین ماں اور سکھ باپ کی بیٹی نے ہندوستان کی مصوری میں جدت طرازی اور روایت شکنی کی بنیاد رکھی۔ اپنی عمر کا ایک حصہ یورپی ممالک میں گزارا۔ وہاں کی تربیت اور مشاہدے نے اس کے ٹیلنٹ کو جلا بخشی تھی۔ وہ تجریدیت کے بجائے پوسٹ امپریشنسٹ طرز مصوری کی پیداوار تھی۔

رات کی خاموشی پر لمحے گہری ہوتی جا رہی تھی۔ امام نے کھڑکی کے باہر جھانکا۔ چوکیدار ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں موٹا ڈنڈا لیے وہ جو تھوڑی دیر بعد زمین پر ٹھوکتا تھا۔ اس کی ٹھک ٹھک نے کچھ دیر کے لیے خاموشی میں خلل ڈالا تھا۔ امام نے صراحی میں سے ایک گلاس پانی بھرا۔ اس کے چند گھونٹ لیے اور گلاس کو میز پر رکھ کر پھر سے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

امرتا پہلی بار اپنے باپ کے وطن آئی تو ہندوستان کے نرالے مناظر اور خوشبوؤں نے اسے مبہوت کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی فاقہ کش لوگوں کے ناخوش چہروں نے اس پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مفلس ہندوستانیوں کی زندگیوں کا تصویری عکس پیش کرے گی۔ ایک نئی تکنیک کے ذریعے جو اس کی اپنی تھی۔ وہ روایت سے منحرف ہو گی لیکن اس کی بنیادی روح ہندوستانی رہے گی۔ اسے یہاں کے عام لوگوں کی آنکھیں بے چمک، چہروں پر صبر اور ناامیدی نظر آئی تھی۔ عورتیں خانقاہی زندگیوں میں محبوس لگتی تھیں جو سایوں کی طرح چلتی تھیں۔
امرتا نے جب مستقل طور پر یورپ سے ہندوستان آنے کا فیصلہ کیا تو کسی سے کہا تھا "یورپ میں پکاسو، ماتیس اور بہت سے دوسرے ہیں جبکہ ہندوستان میں صرف میں ہوں گی۔"

رات دبے پاؤں گزر رہی تھی۔ امام کو خبر تک نہ ہوئی کہ پچھلے پہر میں اس کے کمرے کی روشنی جل رہی تھی۔ امرتا نے اس کے اردگرد کو روشن کر کے سمت کا تعین کیا تھا۔

امرتا 1941ء میں صرف انتیس برس کی عمر میں لاہور میں انتقال کر گئی۔ اس نے مرنے سے قبل اپنے ایک لیکچر میں کہا تھا: "ان روایتوں سے نہ چپکے رہو جو کبھی ناگزیر، پر خلوص اور شاندار تھیں۔ وہ اب ایک خالی فارمولا بن گئی ہیں۔ نہ ہی غلامانہ طور پر کسی پانچویں درجے کے مغربی آرٹ کی تقلید کرو۔ دونوں سے دور نکل جاؤ اور کچھ نیا بھرپور آرٹ پیدا کرو جو اپنی مٹی سے جڑا ہو۔" امرتا نے خود یہی کیا تھا۔ اس کے ہاں رنگوں سے والہانہ لگاؤ تھا۔ وہ گہری رنگت کی معمولی صورتوں میں حسن تلاش کرتی تھی۔ جب وہ فطرت کے اثر سے دور رہتی تھی تو اس کے فکر انگیز برتاؤ سے کینوس پر ساکت پیکر ابھرنے لگے۔ جو اپنے آپ میں مکمل مگر ایک دوسرے سے متصل تھے۔ اونٹ جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی، اس کے ریوڑ کو اس محبت سے سنبھالا کہ بے ہنگم صحرائی جانور حسین لگنے لگا۔ گہرے رنگوں سے مزین کاٹھی کے رنگین پھندنوں والے اونٹ کے پس منظر میں دو سفید پوش، رنگ و نقش کے امتزاج کی دلکش دستاویز۔ امرتا کینوس کی اساسیات سے گویا اسکیچنگ کرتی تھی۔

والدین اور استادوں کی میٹنگ تھی۔ اسکول کے صحن اور سڑک پر لمبی لمبی گاڑیوں اور جیپوں کی قطاریں لگی تھیں جن میں سے گھیر دار شلواروں، لمبی قمیصوں، بہت سی مونچھوں، گھنی داڑھیوں اور پگڑیوں والے مرد خاصی تعداد میں برآمد ہوئے تھے۔ امام کے لیے یہ منظر دلچسپ تھا۔ ٹیچرز کے حلقے میں ایک دراز قد، دبلے پتلے، گورے اور سیاہ گھنگریالے بالوں والے نوجوان کی موجودگی علاقے کے والدوں کو بھلی لگ رہی تھی۔ میٹنگ کی کارروائی معمول کے مطابق بچوں کی رپورٹوں اور والدین کے لیے مشوروں وغیرہ کے بعد ختم ہوگئی۔ ٹیچرز آنے والے مہمانوں کو رخصت کرتے ہوئے ان سے مصافحہ کر رہے تھے۔ ایک نوجوان امام کی طرف بڑھا۔ اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ میں مخدوم ریاض ہوں۔ بتایا کہ ان کا بیٹا امام کا شاگرد ہے۔ وہ اپنے نئے ٹیچر سے اتنا متاثر ہے کہ وہ پینٹر بننا چاہتا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا بچو، سیاست دانوں کے خاندان کی اولاد ہو۔ تم بھلے سے تصویریں بنانے کا شوق پورا کرتے رہو۔ آخر تمہیں اسمبلی میں ہی بیٹھنا ہے۔

"ابھی تو بچہ ہے۔ اسے پڑھنے دیں۔ بڑا ہو کر وہ جو بھی فیصلہ کرے۔" امام نے متین لہجے میں کہا۔

"سر، میں پڑھائی کے حق میں ہوں۔ مجھے بابا نے علی گڑھ پڑھنے کے لیے بھیجا تو پاکستان بن گیا۔ میں نے لاہور کے ایف سی کالج میں داخلہ لے لیا، مگر والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے پڑھائی چھوڑ کر آنا پڑا۔ کیونکہ مجھے ہی زمینوں کا کاروبار سنبھالنا تھا۔"

امام اور مخدوم ریاض باتیں کرتے کرتے گیٹ تک آگئے۔ ریاض خدا حافظ کہہ کر جیپ کی طرف بڑھا، یکدم پلٹا۔

"آپ ہمارے مہمان ہیں۔ ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔ میں ہر اتوار کو شکار پر جاتا ہوں یہاں بڑی کثرت

پائے جاتے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ تفریح ہو جائے گی۔"

یہ لوگ ہرن جیسے خوب صورت جانور کو مارتے ہیں؟ امام نے دل میں سوچا۔

"میں شکار نہیں کھیلتا۔ امید ہے آپ برا نہیں منائیں گے۔ پلیز ڈونٹ مائنڈ۔"

"کوئی بات نہیں جی۔ آپ ہمارے ساتھ زمینوں پر چلیں۔ میرا دیوان خانہ آپ کے لیے ہمیشہ کھلا ہے۔"

بہاولپور کے دیہی علاقوں کی سیاحت امام کے لیے پسندیدہ پیشکش تھی۔

"ٹھیک ہے۔ پروگرام بنائیں گے بلکہ میری خواہش ہے کہ میں چولستان کا صحرا دیکھوں۔ سنا ہے بہت پراسرار علاقہ ہے۔"

گل ہی کوئی نہیں جناب! آپ جب حکم کریں۔ پہلے آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائیں۔ اس سے میری عزت افزائی ہوگی۔"

وہ اجنبی شخص چند لمحوں میں دوست لگنے لگا تھا۔ اس کی باتوں میں سادگی اور خلوص تھا۔

نواب بہاول خان کے نام پر رکھی گئی ریاست بہاولپور کو پاکستان بننے کے بعد صوبہ پنجاب میں شامل کر دیا گیا۔ اس پر ریاستی ناخوش تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ جنوبی پنجاب کے ان تمام علاقوں پر مشتمل جن میں سرائیکی بولی جاتی تھی، ایک علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔

امام شام کو فارغ ہوتا تو بازار کی طرف نکل جاتا۔ یہاں کے مرد زیادہ تر لنگی پہنتے تھے۔ عورتیں یا تو گھاگرا پہنتی تھیں یا پھر لنگی۔ دکانوں اور ریڑھیوں پر مٹی کے برتن دیکھ کر وہ رک جاتا۔ وہ سب نہایت نفاست سے تیار کیے گئے تھے جن کے نقش و نگار دیکھ کر امام کو راجستھان کے رنگ یاد آتے تھے۔

"بابو صاب، یہ لے لو سستی دے دوں گی۔ صبح سے بکری نہیں ہوئی۔" ایک عورت ہاتھ میں تنکوں سے بنی ہوئی پلیٹ لیے کھڑی تھی۔"

یہ کیا ہے، اس میں کھانا تو نہیں کھا سکتے۔"

"بابو، یہ چنگیر ہے۔ اس میں روٹی رکھتے ہیں۔" وہ سرائیکی بول رہی تھی۔ جسے جوڑ توڑ کر امام نے مطلب نکال لیا تھا۔

جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ ریزگاری نکالی۔

"کتنے کی ہے؟"

"دو روپے کی۔ چلو آپ ایک روپیہ دے دو۔"

"کھجور کے پتوں سے بنائی گئی چنگیر کی تجریدی اشکال، سنہری رنگ پہ ہرے، سرخ اور نیلے رنگوں کا امتزاج۔ اتنی محنت کے بعد صرف ایک روپیہ۔"

امام نے دو چھوٹی چھوٹی چنگیریں اور خرید لیں۔ ان پر رنگین پھندنے ٹانکے گئے تھے۔

"لاہور لے جاؤں گا، دکھاؤں گا آرٹ گروپ کے اپنے دوستوں کو کہ ان پسماندہ علاقوں کے رہنے والے کتنے اچھے فن کار ہیں۔ یہ ان کا ایکسپریشنزم ہے۔ کھجور کے پتوں کی کترنوں سے اپنی کینوس بھی بناتے ہیں اور اس پر رنگدار کترنوں سے مصوری کرتے ہیں۔ یہی ان کی تجریدیت ہے۔"

امام اپنی اس دریافت پر خوش تھا۔

ریاض کی دوستی اور تپاک بے لوث تھا۔ جس نے نئی جگہ کی اجنبیت کو چند ہی دنوں میں گھلا دیا تھا۔ ہفتے میں ایک دو بار اس سے ملاقات ہو جاتی جو زیادہ تر اس کے ڈیرے پر ہوتی تھی۔ امام کو لانے اور چھوڑنے کے لیے، ریاض کی جیپ ہر وقت تیار رہتی۔ کھانے پینے کا بندوبست امام کے میزبان کے لیے جیسے ایک راحت ہو جو اس کی عادت بنتی جا رہی تھی۔ امام اس طرح کی خاطر تواضع کا عادی نہیں تھا لیکن خوشی تسلیم کرتا تھا۔

کھجور کے درختوں کے جھنڈ کی چھدری چھاؤں میں چارپائی پر بیٹھا ہوا وہ کھیتوں میں چھاج سے اناج پھٹکتی عورتوں کا اسکیچ بنانے لگا۔ وہ عورتیں خوب صورت نہیں تھیں۔ لیکن ان کے وجود میں زندگی کرنے کا عزم تھا۔ اپنے ہاتھوں سے کما کر کھانے والے لوگ۔ وہ جو ہر علاقے کا اصل ہوتے ہیں۔ ڈبیوں والی دھوتی اور میلا سفید کرتہ پہنے وہ عورت اپنے گرد و پیش سے بے خبر تھی۔ اناج کے دانے بارش کی بوچھاڑ کی طرح اس کے چھاج سے گرتے جاتے تھے۔ ایک ردھم کے ساتھ۔ عورت اس کی لے میں مست تھی۔ کچھ فاصلے پر سر پر صافہ پہنے اس کے شوہر کے حقے کی گڑگڑاہٹ، کھالے میں بہتا ہوا شفاف پانی کے بہاؤ کی دھیمی دھیمی آواز، اس سب نے ماحول میں ایک نغمگی پیدا کر دی تھی۔ امام دیر تک نیلے آسمان کے نیچے کے اس منظر کی دلکش سادگی میں کھویا رہا۔ کھیتوں میں لہلہاتی ہوئی، گندم کے بھوسے کو اڑاتی، کھجور کے درختوں کی جھالروں کو جھلاتی ہوئی ہوا، طویل مسافتیں طے کرتی ہوئی، اس کے بدن کو چھونے والی ہوا اسے اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے بھی وہ دو سے بہاولپور تک کے طویل فاصلے کاٹے تھے۔ وہ بھی ہوا کی تازگی کی طرح ہر قسم کی تھکان سے دور تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ نیم صحرائی مٹی، جس پر اس نے قدم رکھے ہیں اسے یہاں سے کہیں اور جانا ہے۔ کچھ اور کرنا ہے۔ مشاہدے کے اس باب نے

اس کی حیات کو نیا رنگ دے رہا تھا۔ لیکن سفر جاری تھا۔

امام بہاولپور کے لاری اڈے پر کھڑا تھا۔ صفدر کا خط آیا تھا کہ شاکر علی کراچی سے لاہور آ گئے ہیں۔ وہ مصر تھا کہ تم جلد لاہور آ جاؤ۔ ہم نے ایک گروپ شو کا پروگرام بنایا ہے۔ لیکن اسے تمہارے آنے کے بعد فائنل کریں گے۔ امام کچھ پس و پیش میں تھا۔ وہ لاہور جانے سے قبل اس علاقے کو مزید جاننا اور سمجھنا چاہتا تھا۔

کنڈکٹر نے بس کی باڈی پر دو تین زوردار دھپ لگائے۔

"روکو، روکو، سواری ہے۔ اے بابو، بابو، سائیں کتھے جانا اے۔" امام بس کی طرف بڑھا۔ جو پہلے سے بھری ہوئی تھی۔

"مجھے ملتان جانا ہے۔ کیا دوسری بس آئے گی۔ اس میں تو جگہ نہیں ہے۔"

"فکر نہ کرو، ابھی جگہ بن جائے گی۔ اگلے اسٹاپ پر بہت سی سواریاں اتر جائیں گی۔ بس آدھے گھنٹے کا فاصلہ ہے۔"

امام بس میں سوار ہو گیا۔ بوڑھے جوان مرد، عورتیں ان کے بچے اور گٹھڑیاں۔"

"بابو اس پیٹی پر بیٹھ جاؤ۔" پچھلی بس میں چھت کے ڈنڈے کو پکڑے اور بریک لگنے پر جھولنے والے امام کو ایک بڈھے نے پیشکش کی۔

اسے مقامی لوگوں کے ساتھ سفر کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ تیز نیلے سرخ اور پیلے رنگ کی چھاپے دار لنگی اور سر پر پگ باندھے اس مرد کے ساتھ جو جواں سال عورت بیٹھی تھی اس نے کالا گھگھرے پر تیز پیلی کرتی اور جھلیوں والا عنابی رنگ کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ امام اس پر اچٹتی نگاہ ڈالتا اور پھر بس کی کھڑکی کے باہر ریتلی زمین اور کانٹے دار جھاڑیوں کو دیکھنے لگتا۔ نیم صحرائی علاقے کی بے رنگی میں اس کی کرتی اور دوپٹے کے تیز رنگوں نے رونق لگا دی تھی۔ اس نے پہلو بدلا۔ محتاط ہو کر بیٹھ گیا۔ کہیں اس کا مرد یہ نہ سمجھے کہ وہ اس کی عورت کو تاڑ رہا ہے۔ ریاض کہہ رہا تھا یہاں کے لوگ بہت شکی مزاج ہیں۔ معمولی سی جھجک پر انتہائی قدم اٹھا لینا ان کی عادت ہے۔ مگر — امام سوچ رہا تھا۔ "اس کی چاندی کی بالیوں اور نتھ نے اسے تصویر بنا دیا ہے۔"

کنڈکٹر نے پھر اپنی بس کو دو دھپ لگائے۔

"ہاں بھئی قصیر والی والے اتر جائیں۔" بہت سے مسافر اتر گئے۔ اور وہ بھی۔ چاندی کی بالیوں والی۔ منظر خالی ہو گیا تھا۔

کنڈکٹر نے چلا کر کہا۔ "پانچ منٹ یہاں رکیں گے جس نے پانی وانی کھانا پینا ہو وہ کھا پی لے۔"

اڈے پر دو تین دکانیں تھیں۔ چائے، لسی اور سوڈے کی بوتلیں۔ امام نے ایک پیالی چائے لی۔ سامنے دیکھا تو سڑک

کے کنارے کچھ خوش رنگ چیزیں نظر آئیں۔ ان کی طرف بڑھا۔ وہ کاغذ اور تیلیوں سے بنائے ہوئے گھوڑے، طوطے، چڑیاں اور کچھ حریدہ چیزیں تھیں۔ ایک عورت زمین پر بیٹھی گاہک سے سودا کر رہی تھی۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ تو کچھ کچھ گھوڑے ہیں۔ بازروں کے کھلونے۔"

"کہاں رہتی ہو؟"

"تجھے جال جائے۔" وہ عورت جو کچھ کہہ رہی تھی امام کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ امام کا تجسس دیکھ کر ایک بچہ کا اس کے پاس کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ کسی قریبی گاؤں کے اسکول میں پڑھتا تھا۔ اسی نے بتایا تھا کہ یہ بھی باس ہیں۔ رنگ برنگے کاغذوں کو تنی سے جوڑ کر یہ لوگ اپنی نقش کاری اور مجسمہ سازی خود کرتے ہیں۔ یہ ان کی کمگری ہے۔

امام کو بہاولپور کے نوابوں کے محل عام لوگوں کے کچے مکانوں سے بہت اونچے دکھائی دیتے تھے۔ ان کے چہروں پر محرومیوں اور مظلومیت کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ جبکہ ملتان کی اٹک کے اندر، چھوٹی چھوٹی گلیوں کے کنارے کئی منزلہ چوبارے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ جن میں بیوپاریوں، دستکاروں اور کاریگروں کے کنبے بستے تھے۔ امام وہاں بحران کی زندگی ہو وہاں سے خود کو توانائی پہنچاتا رہا۔ جیسے کوئی کیا ذہن، دانشور کی گفتگو سے فیض پاتا ہے۔ ملتان میں ماضی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

یہ وہی ملتان تھا۔ جس کی ایک سرائے کے صحن کے چبوترے پر امیر خسرو ستار بجاتا تھا۔ جہاں پر کئی راگ وضع کیے تھے جو قوالی کی بنیاد بن گئی تھی۔ جہاں احمد کی مہارانی پدماوتی کتھک رقص کو دیکھنے گئے جنگلوں اور دریاؤں کو پار کر ملتان پہنچی تھی۔ وہ زہرہ بائی آگرے والی کا دیوان اور لاؤں کی کافیاں سننے آئی تھی۔ جہاں میاں منگ کے میلے کی بیسی آواز کا ترنم فضا کو سحر انگیز کرتا تھا اور جہاں گوالیار کے پنڈت کرشنا راؤ اپنے شاگردوں کے ساتھ ملتان والوں کو راگ ملتانی میں سمیت اور درت خیال سنانے آیا تھا۔

امام اصطوانی سڑک پر چلتا ہوا ایک بڑے دروازے کے سامنے آ گیا تھا۔ جس میں سے صحن کے اس پار ایک عظیم الشان عمارت کی جھلک دکھائی دی۔ ایک بڑا گنبد اونچائی پر بڑی تمکنت سے ایستادہ تھا۔ وہ فن تعمیر کا ایک شاہکار ضرور تھا لیکن کسی طور صوفی مزاج اور طرزِ فکر سے میل نہیں کھاتا تھا۔

روضی کہہ رہا تھا اسے ایک تغلق بادشاہ نے اپنے لیے بنایا تھا۔ آخری آرامگاہ کے طور۔ پھر اسے شاہ رکن الدین عالم کو تحفتاً دے دیا۔

صحن میں شاہ کے عقیدت مند، منتیں مانگنے والے اور منتیں پوری ہونے پر شکرانے کی نیاز دینے والے ٹولیوں میں بیٹھے تھے۔ پھول والے، چادریں اور اگربتیاں بیچنے والے اپنی بہت سی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے چھوٹے کاروبار کر رہے تھے۔ ایک شخص میلے کچیلے چولے پر رنگ برنگے منکے پہنے اور بالوں کی جھاڑ کو ماتھے پر پھیلائے تان پورا بجا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک آنکھیں موندے گاتا رہا۔ پھر حق کا نعرہ لگاتا اور کشکول میں پڑے سکوں کو کھنکھنانے لگتا۔ امام کا دل مسوس کر رہ گیا۔ علاقے کی غربت، انجانی طاقت سے مدد مانگنے والے لوگ۔ مرشد کے عقیدت مند۔

امام نے صحن میں داخل ہونے سے پہلے دربان کے کہنے پر جوتے اتار دیے تھے۔ لیکن عورتوں کی دو ٹولی جو دروازے کی طرف بڑھ رہی تھیں انہوں نے اپنی جوتیاں گٹھڑیوں میں اٹکائی ہوئی تھیں۔ یہ ان کی عقیدت مندی تھی۔ یہ لوگ مرشد کے متبرک شہر میں داخل ہونے سے پہلے اپنے جوتے اتار دیتے ہیں، ورنہ شہر کی بے حرمتی ہوگی۔

ایاز نے انہیں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔

"لیکن شاہ جی آپ آج واپس نہیں جا سکتے۔ ایاز نے کہا۔" آپ نے شہر گھوم لیا ہے۔ لیکن ایک شام تو ہمارے ساتھ گزاریں۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے مزار کو احاطے میں لپٹنے والی سرخ اینٹوں کی دیوار پر بیٹھ گئے۔ تاحد نظر چھوٹے بڑے مکانوں کی چھتیں دکھائی دے رہی تھیں جن کے اوپر، کہیں کہیں ریڈیو کے ایریل کے بانس لگے تھے۔ یہ آبادیاں مزار سے بہت نشیب میں تھیں۔

"دریا پہلے مزار کے قریب بہتا تھا اور لہراتا ہوا گھنٹہ گھر تک چلا جاتا تھا۔ وقت کے ساتھ وہ پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ مقامی لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ شاہ کی کرامات کی بدولت ہٹا تھا۔"

"یہ ان کی معصوم لاعلمی ہے۔ وہ اس کے علاوہ کسی منطق کو تسلیم نہیں کریں گے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

امام نے مزار کی عمارت کو نیچے سے اوپر تک بغور دیکھا۔

"معماروں نے بہت عمدہ طریقے سے نقش اینٹوں کو ترتیب دیا ہے۔"

"جی، یہ اینٹیں کاشی کاری اور نقش کاری کی ہیں۔ یہ فن چین سے ایران کے شہر کاشان تک پہنچا تھا اور محمد بن قاسم کے ساتھ ہندوستان آیا۔"

کاشی کاری کے کاریگر برسوں سے نسل در نسل اس فن پر کاربند ہیں۔ یہ صنعت ملتان میں پروان چڑھی۔ شاہجہاں نے ٹھٹھہ میں مسجد کی آرائش کے لیے کاشی کاری کی اینٹیں ملتان ہی سے منگوائی تھیں۔ کاشی کاری میں نیلے اور سفید رنگوں کے امتزاج سے بنائے گئے موٹفس اقلیدی ہیں۔ یہاں قواعد کی پابندی نظر آتی ہے جبکہ نقش کاری میں طے شدہ نظم و ضبط سے انحراف ملتا ہے۔ نقش کار رنگوں کے استعمال اور ہیئتوں کی تشکیل میں، خود کو اپنے احساس کو اس عمل کا حصہ بنا کر ایک عمل رچاتا ہے۔

شام ڈھلے ایاز اپنے مہمان کو ایک محفل میں لے گیا۔ فضا میں گلاب اور چنبیلی کی مہک گھلی تھی۔ مسند پر بیٹھا مغنی ہارمونیم کے سروں اور طبلے کی تھاپ کے رچاؤ میں گا رہا تھا—

"میں وی جانا جھوک رانجھن"

وحدت کے گلاسوں میں خوشبودار دودھیا مشروب حلق سے اترا تو سب کچھ خواب آلود ہو گیا تھا۔ رات کی خاموشی، سر تال کی نغمگی، شائقین کی محویت، ایسے جھول رہے تھے کہ گھنگھرو چھنکے۔ یوں جیسے آسمان سے ستارے برسے ہوں اور وہ کائنات کو سرشار کر دیں۔ چھت کی منڈیر پر چڑھ کر مرغے نے بانگ دی تو جانا کہ "او وہ رات بیت گئی۔"

جیپ راستے کی بہت سی ریت اڑاتی، دو گز راستوں سے دامن بچاتی ایک لق و دق عمارت کے سامنے رک گئی تھی۔ یہ جو جبل پور کے ایک شہزادے کا تعمیر کردہ قلعہ ڈراور تھا جسے بعد میں ریاست بہاولپور کے حکمران عباسیوں نے ایک جنگ کے دوران فتح کیا تھا۔

وہ اجنبی نوجوان کچھ سیڑھیاں چڑھ کر قلعے کے داخلی راستے پر کھڑا تھا۔ نوجوان کے میزبانوں کی ہدایت پر قلعے کے نگران نے دروازے کا تالا کھولا۔ دھکا دیا اور چرچراہٹ سے دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ وہ صحن میں داخل ہوا۔ خودرو کانٹے دار جھاڑیوں نے راہداریوں کو بے آرام کر دیا تھا۔ برآمدوں کے فرش کی اینٹیں اپنے جوڑ سے الگ ہو گئی تھیں۔ روشن دانوں میں پرندوں کے گھونسلے اور دیواروں سے لٹکتے ہوئے مکڑیوں کے جالے۔ ہر سو ایک ہیبت پھیلی تھی۔ دلوں کو مسوس کرنے والی اداسی۔ جو اس جگہ پر آ کر خوف میں بدل گئی تھی۔ یہ عقوبت خانے میں اترنے والی سیڑھیوں کا منظر تھا۔ جس کے اندر گھٹی گھٹی تاریکی تھی۔ وہ جگہ، جب طاقتور، کمزور انسان کی آواز کو بغاوت کا الزام لگا کر ہمیشہ کے لیے بند کر دیتا ہے۔ جو دراصل طاقت کی اپنی موت ہوتی ہے۔ جب جبر بے بس ہو جاتا ہے۔

فصیل پر کھڑے ہو کر دور تک نظر بنا کسی رکاوٹ کے آگے تک چلی گئی تھی۔ ایک سپاٹ منظر، جو کہیں کہیں خاردار جھاڑیوں اور ٹیلوں کی ڈھلوانی اونچائی سے ٹوٹتا تھا۔ وہاں کوئی رنگ نہیں تھا۔ سوائے بکرے کی کھال سے بنی سیاہی مائل بھورے رنگ کی مشک کے رنگ کے۔ جسے ایک ناتوان شخص اپنی پیٹھ پر رکھے قلعے کی دیوار کے قریب سے گزر رہا تھا۔ وہاں کوئی آواز نہ تھی سوائے اونٹوں کے گلوں سے بندھی گھنٹیوں کے، جو آہستہ آہستہ دھیمی ہوتی جاتی تھی۔ نہ جانے وہ کہاں جا رہے تھے کہ ان لوگوں کا کبھی کوئی مستقل گھر نہیں ہوتا۔

قلعے کے داخلی دروازے سے نکل کر اوندھے پڑے ہوئے کیکر کے درخت کو دیکھ کر خیال گزرا کہ یہ کمبخت بھی موسموں کی تلخی اور بے آبی کے سامنے ہمت ہار گیا اور اپنی استقامت کھو بیٹھا۔ لیکن اس کے پتے اپنی خاردار شاخوں سے جڑے تھے۔ کملا کر گرے نہیں تھے۔

قلعے کے ارد گرد کی زمین ریت اور کنکریٹ کی عمارت سے الگ ہونے والے ریزوں سے پتھریلی ہو گئی تھی۔ لیکن یہ لوگ کون ہیں جو ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھے قطار بنائے ہوئے تھے۔ نہیں، وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ مٹی کے مادھو تھے وہ جو کبھی کسی گھر کی دیوار رہی ہوگی۔ اسے تند ہواؤں اور کبھی کبھار برسنے والی بارشوں نے کریدا تھا، تراشا تھا اور مٹی کی دیوار کو مجسموں میں بدل دیا تھا۔ چولستان، مقامی لوگوں کے لیے روہی ہے۔ اس میں کتنے تضادات ایک دوسرے کے ساتھ گزر بسر کر رہے تھے۔ مٹی کے مجسموں کے اس طرف کی ہریالی حیرت زدہ کرتی تھی۔

اس نشیبی حصے میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے۔ وہ ٹوبہ تھا اس کا پانی کئی مہینوں تک آس پاس کے رہنے والوں اور راہگیروں کی پیاس بجھاتا رہتا ہے۔ ذہن میں الجھاؤ تھا سامنے سے ایک اونٹ گزر رہا تھا۔ جس کا سوار سر پر تیز سرخ رنگ کی پگڑی پہنے اپنے اونٹ کی پھندنوں اور ریشمی لڑیوں والی کاٹھی پر ایسا بے خیالا جا رہا تھا جیسے اسے نہ کسی کی موجودگی کا احساس تھا اور نہ کسی کے آنے کا انتظار۔ وہ صحرا کی ویرانی کی بکل مارے نہ جانے کس منزل کی طرف رواں تھا۔

O

بانسری بجتی رہتی ہے۔

زندگی کے ورق پلٹتے رہتے ہیں۔ وقت کے پھیکے اور شوخ رنگ، ہلکے اور گہرے انگ، خالی ورقوں پر نقش بناتے رہتے ہیں۔

شاکر علی کہتے تھے۔ الفاظ، رنگ اور لکیریں یا موسیقی کے سُر فن کار کی ذات میں سے گزر کر کاغذ، کینوس یا نغمے کی شکل میں ڈھلتے ہیں۔

فن کی کسی بھی صنف کی آبیاری کے لئے تجربے اور مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسرت کے تجربے، نفرت کے تجربے، محبت کے تجربے، دیکھی ہوئی چیزیں، پڑھے ہوئے الفاظ۔ کھانوں اور مشروبات کے ذائقے، سنی ہوئی باتیں اور نغمے، مناظر، پھول اور درخت۔ تجربات کا تنوع فن کی آبیاری کرتا ہے۔

امام لاہور لوٹ آیا تھا۔

''یار معین، وہ صفدر ہے نا۔''

''کون سا صفدر؟''

''کون سا صفدر!!''

''ارے بھئی۔ میں کل شام بڑے صفدر صاحب کے ساتھ تھا۔ وہ اپنے صفدر میر صاحب۔ اور تم صفدر خورد کی بات کر رہے ہو۔ بہت لوگ دونوں کو گڈمڈ کر دیتے تھے۔ اس لیے ہم نے اس کا نام صفدر خورد رکھ دیا ہے۔''

امام نے قہقہہ لگایا۔ ''ارے ہاں۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ شاکر صاحب سے میری ملاقات کرائے گا۔''

''یہ اپنا صفدر خورد بہت گھن چکر ہے۔ لیکن کوئی نہیں دیتا۔ اس نے اپنے ذمے بہت سارے کام لے رکھے ہیں۔ پرچہ نکالتا ہے۔ ایڈورٹائزنگ کمپنی چلاتا ہے۔ پینٹنگ بھی کرتی ہے اور کسی دوست کے ساتھ شام گزارنے کا بندوبست بھی کرنا ہوتا ہے۔ ابھی پانچ بجے ہیں۔ وہ دفتر میں ہوگا۔ ویسے بھی شام کے وقت شاکر صاحب سے ملنا مشکل ہے۔''

''کیوں؟''

''وہ اپنی ہر شام سید حسن کے ہاں گزارتے ہیں۔ شاکر صاحب بھی کمال کے آدمی ہیں۔ میں ایک روز ان کے ہاں گیا تو وہ گھر پر نہیں تھے۔ ان کا ملازم ٹفن کو سائیکل کے ساتھ باندھے باہر نکل رہا تھا۔ بتانے لگا کہ شاکر صاحب کا کھانا پہنچانے جا رہا ہوں۔ وہ سید صاحب کے گھر پر اپنے گھر کا کھانا کھاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سید کے گھر کا کھانا پھیکا ہوتا ہے۔ اتنے برس باہر رہے ہیں لیکن کھانا مرچوں والا چاہیے۔''

''شاکر علی پاکستان لوٹتے ہوئے چیکوسلواکیا سے اپنی محبوبہ کو بیوی بنا کر لائے تھے۔ ان کا ارادہ کراچی میں بسنے ہونے کا تھا۔ وہاں انہیں ایک جاب بھی مل گئی تھی۔ لیکن بیوی سے جھگڑ ہوگئی۔ دل ٹوٹا تو لاہور چلے آئے۔ انہیں لاہور

پسند ہے۔ کچھ دوست بن گئے ہیں۔ گلشن آباد میں ان کا گھر سید حسن کے گھر سے بہت قریب ہے۔ وہ ان کی رفاقت میں خوش رہتے ہیں۔"

شاکر پاکستان کے پیزان تھے۔ انہوں نے لاہور کے نوعمر مصوروں کو عصر حاضر کی نمائندگی کی ترغیب کے ساتھ ان کی راہ میں روشنی جلائی۔ انہیں روایت سے نکل کر جدت اور تجریدیت کی جانب رخ کرنے کے لیے ایک استاد کی ضرورت تھی۔ علی امام، معین نجمی، منصور، ظہور الاخلاق نے یہ استاد شاکر علی سے حاصل کیا۔ ان کے اسلوب سے ان کی باتوں سے ان کی محبت میں۔

بانسری بجے گی۔

"تبدیلی ناگزیر ہے۔ کیوبزم اور رانچوت کے اسلوب کو کانی گھات کی مصوری نے نئی نہج پر ڈالا۔ سب سے اہم اور ایک مشکل کام یہ کہ موجودہ نمائندگی کرتے ہوئے قدیم سے ناطہ جڑا رہے۔" مجھے یوں لگتا ہے کہ میں التامیرا کے نقاشوں کے ساتھ جڑا ہوں۔" شاکر کہتے تھے۔

ہزاروں سال پہلے، اسپین کے شمالی پہاڑوں میں التامیرا کی غاروں میں رہنے والا اپنی غذا کے لیے بیل، ہرن اور گھوڑوں کا شکار کرتا تھا۔ ان کی کھال سے لباس اور ضرورت کی دیگر چیزیں بناتا۔ وقت ملتا تو غار کی اندرونی پتھریلی سطح پر کوئلے اور مٹی کے رنگوں سے اپنے مفتوح کی اشکال بنانے لگتا۔ اس کی تخلیقی حس ہموار سطح کا تقاضا نہیں کرتی تھی۔ وہ چٹان کی ناہمواری کو اپنی جیبنوں سے اس طرح ہم آہنگ کرتا کہ اس کا شکار تجسیم مجسمے کے طور اپنے اصل کا پرتو پیش کرتا۔

"تی سر، آپ کے لیے کچھ اور" امام نے پیشکش کی۔

"ہاں، ہاں لو" شاکر نے اپنا گلاس امام کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

سرائی، کیوس کی زیریں سطح سے آہستہ آہستہ اوپر کا رخ کرتی ہے۔ لمحہ لمحہ بلندی کے فاصلے طے کرتی ہے۔ اور جب وہ اوج پاتی ہے تو ایک لیمپ پوسٹ کی وضع اختیار کر لیتی ہے۔

"شاکر علی کی امیجری، چھوٹی برش کا تقول، خطوط اور رنگوں کا اختصار۔ گہرے سبز رنگ کے ہالے میں دو چھوٹے پرندے۔ سبز امید کا رنگ ہے اور یہ دو پرندوں کا ملاپ۔

"میرے اندر ایک پرندہ گاتا رہتا ہے۔ ہر ایک کے اندر ایک پرندہ ہوتا ہے۔ وہ جو وسعت بیکراں میں پرواز کرنے کا خواہش مند ہے۔ لیکن رسوم وقیود کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ اگر جذبہ مضبوط ہو تو وہ ان حد بندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اندر سے باہر کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس کا اظہار ہو پاتا ہے۔"

بانسری بجنے لگی ہے

6

میری نظریں، روشن پہاڑیوں کو چھو چکی ہیں، اس سڑک کے بہت آگے تک، جو میں نے شروع کی تھی۔
ہم منحرف ہوئے اس سے، جسے گرفت میں لانا ممکن نہ تھا۔
ہمیں تبدیل کیا، بے شک ہم وہاں تک نہ پہنچ پائیں ——— رلکے

ٹیوب اسٹیشن سے باہر آ کر امام ٹریفالگر اسکوائر کی جانب چل رہا تھا۔ آج بھی لندن کا موسم ابر آلود تھا۔ گہرے بادلوں سے فضا جس قدر رنگیلی ہوتی لندن کی بھوری بھوری عمارتیں مزید پراسرار نظر آنے لگتی تھیں۔ بہت سی واضح چیزیں دھندلا جاتی تھیں۔ یہ شہر جہاں وہ ابھی اجنبی تھا، اس نے اپنے دریچے کھول دیے تھے کہ ہوا کے جھونکے نئے موسموں کا پتہ دیتے تھے۔ راستے نئی منزلوں کی دریافت پر اکساتے تھے۔

وہ نیشنل گیلری میں داخل ہونے والے چبوترے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا تھا۔ فوارے کے اردگرد انہماک سے دانہ چگتے اور دانے کے لیے مسلسل پر جھنڈ کی صورت میں اترنے والے کبوتروں کو پراشتیاق نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس نے یہاں آ کر ایک آرٹس اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ یہاں بھی اپنی کفالت کا مسئلہ تھا۔ اس لیے دن کے وقت ملازمت اور شام کو آرٹ کلاسیں لینا مجبوری تھی۔ ایک جگہ فلیٹ اپارٹمنٹ کا مل گیا تھا۔ احمد پرویز پہلے سے لندن میں موجود تھا۔ اس نے پیشکش کی کہ وہ اس کے ساتھ رہنے لگے۔ تمام اخراجات بانٹ لیا کریں گے۔ امام کو پڑھائی اور ملازمت سے جو فرصت ملتی تو وہ آرٹ گیلریوں کا رخ کرتا اور گھنٹوں وہاں مشغول رہتا۔ آرٹس اسکول میں نئے فنکاروں اور ان کے اسلوب کو دیکھنا ایک خوشگوار عمل تھا۔ لیکن امام کی تحقیقی حس کو یورپ کے قدیم مصوروں اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے سے ہی تسکین ملتی تھی۔

چودھویں صدی میں فلورنس نے اقتصادی، سیاسی اور تخلیقی فن میں تیزی سے ترقی کی تھی۔ امام کے سامنے فلورنس کے ایک مصور فرانسیسکا کی تصویر میلاد مسیح تھی۔ جس میں حمدیہ گیت گانے والی گلوکارہ اور جوزف ایک گدھے کی کاٹھی پر

بیٹھے تھے۔

جس طرح ایلورا اجنتا کے مصوروں نے جاتک کہانیوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے بدھ کی زندگی کی عکاسی کی تھی۔ اسی طرح مغرب کے قدیم مصوروں نے میڈونا اور بچے کو بار بار اور یار بار دوہرایا۔ بائبل کے واقعات اور موضوعات پر قرون وسطی کے مصوروں نے بے شمار تصاویر تخلیق کیں۔ جن میں بیشتر حکام یا با اختیار افراد کی طرف سے مامور کئے جانے پر تیار کی جاتی تھیں۔

امام کئی گھنٹوں تک گیلری کے مختلف ادوار اور ممالک کے فن پاروں کے مطالعے کے بعد اب کیفے میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ایک کافی منگوائی۔ اس نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ اس کیفے میں سینڈوچ خریدنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ کافی کے گرم گھونٹ کو حلق سے اتارتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ یہاں سے نکل کر کہیں سے کھانے کے لیے کچھ خریدے گا۔ اس نے بیگ سے کتاب نکالی۔ سگریٹ جلایا اور کیفے کے ماحول کو محسوس کرنے لگا۔ لندن کا ماحول یقینی طور پر پاکستان سے مختلف تھا۔ کھلا کھلا۔ بے جھجک مسکراہٹوں سے بھرا۔ ایک لوعمر لڑکی نے کرسی کھینچتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں یہاں بیٹھ جاؤں۔" لڑکی خوبصورت تھی۔ جوان تھی۔ وہ اپنے لیے ایک لیمونیڈ کا آرڈر دے کر اپنے ہم نشین سے لاتعلق گیلری کے بروشر کو دیکھنے لگی تھی۔ امام کو اس لڑکی کی خود اعتمادی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ سوچ کر وہاں سے اٹھ گیا کہ کہیں وہ اس جسارت پر برا نہ مان جائے۔ حالانکہ اسے یقین تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔

وہ شام کو گھر لوٹا تو ایزل پر لگی ہوئی اپنی ادھوری تصویر میں رنگ لگانے لگا۔ اسے کیفے میں ملنے والی لڑکی کے چہرے کے خدوخال، نیلی آنکھوں، پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں کا خیال آ رہا۔ لیکن اس کی تصویر بنانے کی خواہش نہ تھی۔ اس کے ایزل پر جو پیکر تھا وہ ان لوگوں میں سے ایک کا عکس تھا جو اسے پاکستان کے شہروں کے گنجان علاقوں اور دھول سے اٹی ہوئی دیہاتی پگڈنڈیوں اور کھیتوں میں نظر آتے تھے۔

امام نے بیئر کھولی سگریٹ جلایا۔ اس کا دھیان گیلری کی تصاویر کی طرف لوٹ گیا۔

وینس کے مصوروں نے یسوع مسیح کے حالات زندگی پر چہروں اور اجسام کی تصاویر میں لینڈ اسکیپ کی امیجری شامل کی۔ یورپی آرٹ میں صدیوں تک مذہبی کہانیاں اور تمثیلی حکایتیں قابل فروخت مال رہی تھیں۔ لیکن زمانے نے مروجہ

موضوعات کے بجائے فوری سچائی بیان کی۔ وہ جو اس لمحے کی سچائی تھی جس میں وہ زندہ تھا۔ میکسیکی بادشاہ کا قتل ایک خوفناک سچائی تھی۔ اس کیفیت کی بھرپور عکاسی۔ یہ مانے کا ثبوت تھا کہ ناظر اس واقعے کا گواہ بن جائے اور اس کی شدت سے واقف ہو جائے۔ مانے کا، جو ان فرانس میں تمام اکیڈیمک طرز مصوری کے خلاف بغاوت کی علامت تھا۔

امام آرٹس اسکول سے نکلا تو اسے نسوانی قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ قدموں کی آواز قریب ہو رہی تھی اور پھر——

"اوہیلو"

"ہیلو، میں نے اکثر تمہیں اسکول میں دیکھا ہے۔"

"یس، میں جانتی ہوں تم وہاں پڑھتے ہو۔ میرا نام مورین ہے۔"

"میں علی امام ہوں۔"

"اوہ۔ میلی امیم"

"امام نے اس کا تلفظ ٹھیک نہیں کیا۔"

"میں پاکستان سے ہوں۔"

"میں برٹش ہوں۔"

"تم سے مل کر——"

"خوشی ہوئی" مورین نے ہنستے ہوئے امام کا جملہ پورا کر دیا۔ "چلو کہیں بیٹھ کر کچھ پئیں۔ کافی——یا——"

"آج نہیں، کسی اور روز چلیں گے۔ مجھے آج اپنے کچھ دوستوں سے ملنا ہے۔ وہ بھی پاکستان کے آرٹسٹ ہیں۔"

"نیور مائنڈ۔" مورین آگے بڑھ گئی۔ اسے امام کا انکار اچھا نہیں لگا تھا۔

"مورین، سنو، تم کل آؤ گی نا، وعدہ۔ کل ہم کلاس کے بعد ملیں گے۔ کہیں بھی چلیں گے پھر یہ ہوگا۔" امام نے لپک کر مورین کو مایوسی سے باہر نکالنا چاہا۔

مورین مسکرائی۔ "میں کل کا انتظار کروں گی۔" امام حیرت زدہ تھا۔ وہ کل آئے گی؟ اوہ میں بھی احمق ہوں۔ پہلے ایک خوبصورت لڑکی کی پیشکش رد کر دی اور اب——"

وہ پکاڈلی کی رونقوں میں سے اپنا راستہ بناتا ہوا پیدل پیدل سوہو تک پہنچ گیا تھا۔ اسے کچھ پینے کی خواہش ہو رہی تھی۔

اس نے ٹھنڈی مشروب خریدی اور ایک بنچ پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ یہاں پہلے بھی کئی بار آ چکا تھا۔ پرویز، معین، قطب، اظہر۔ وہ سب یہاں آ کر بہت مستی میں آ جاتے تھے۔ اپنی اپنی پسند کے پروگرام بناتے۔ شروع شروع میں امام ان کا ساتھ دینے سے ہچکچاتا تو وہ اس کا مذاق اڑاتے اور اس پر پارسائی کی تہمت لگا کر زور زور سے قہقہے لگاتے۔ اس روز وہ اکیلا تھا۔ خوش دلی میں بھیگے ہوئے ماحول میں۔ جہاں ایک عمارت کے کسی فلیٹ میں ولیم بلیک پیدا ہوا تھا۔ نیشنل گیلری میں مصوری کے مختلف ادوار کے لیے مختص ایک ہال میں ولیم بلیک کا نام پڑھ کر وہ ٹھٹکا تھا۔ اس نے بلیک کو بطور شاعر اپنی نصابی کتابوں میں پڑھا تھا۔ وہ اس کے مصوری کے شغف سے ناواقف تھا۔

ولیم بلیک انیسویں صدی کا ایک کامیاب شاعر تھا لیکن وہ اظہار کی نئی جہت مصوری میں زیادہ اہمیت نہ حاصل کر سکا۔ وہ بائبل کی کہانیوں کو اپنے انداز میں بیان کرتا تھا۔ اس کے اپنے اپنے تھے۔ اس نے شیطان کو منطق کے نظام کے طور پر پیش کیا تھا۔

موریں کے مزاج میں ایک سلجھاؤ تھا۔ وہ عمر میں امام سے دس سال چھوٹی تھی۔ امام اس وقت 32 سال کا تھا۔ اسے موریں کی صورت میں ایک مخلص اور بے تاب ساتھی مل گیا تھا۔ موریں کو بھی امام کے ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا بڑی بھلی لگی تھی۔ امام کے لیے لندن ایکدم روشن ہو گیا تھا۔ جس میں موریں کی نیلی آنکھوں کی چمک شامل تھی۔ اس کی ہنسی نے ادھر ادھر لہراتے سرمئی پردوں کو ہٹا دیا تھا۔ بارش کے قطروں میں جلترنگ سنائی دینے لگا تھا۔ دونوں آرٹ کی کلاس کے بعد چلتے چلتے دور تک نکل جاتے۔ امام کی تصویروں کی نمائش تھی۔ بہت لوگ آئے تھے۔ ہاتھوں میں مشروبات کے گلاس لیے تصویریں دیکھتے ہوئے۔ ہال کے درمیان ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے۔ فن کار کے لیے تعریفی کلمات۔ کیمروں کی فلک اور جھپکتی ہوئی روشنیاں۔ ماحول نے نوعمر موریں کو سرشار کر دیا تھا۔ اس نے اپنا بازو امام کے بازو میں جکڑ دیا تھا۔

اس روز امام بھی بہت خوش تھا۔ اس کی بہت سی تصویروں پر فروخت کے سرخ ڈاٹس لگ چکے تھے یا اس کی بڑی کامیابی تھی۔ جس نے اوپر کی طرف جانے والے زینے کو واضح کر دیا تھا۔

"چلو، آج میری طرف سے ٹریٹ" امام نے موریں کو اپنی خوشی میں شریک کرتے ہوئے کہا۔ "اس یہاں سے سیدھے تھیٹر چلیں گے۔ آج ہم بیلے دیکھیں گے۔ "سوان لیک" کے آخری چند روز ہیں۔ اسے مس نہیں کرنا چاہیے۔"

"ٹیم" موریں نے تقریباً چہکتے ہوئے کہا۔ اور امام کی گردن میں اپنے بازوؤں کا ہار ڈال دیا۔

شو کے شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ امام نے ٹکٹ خرید کر مورین کو کینٹین میں کچھ کھانے پینے کی پیشکش کی۔ مورین سوان لیک کا بروشر پڑھ رہی تھی۔

”آئی لو، یہ ایک یونانی کہانی ہے۔ میں نے پڑھا تھا کہ جب پالو پیدا ہوا تھا تو اس کے سر پر ہنسوں کا رقص ہو رہا تھا۔“

”ہاں، لیکن یہ بیلے روسی ہے۔ اس کی موسیقی چائیکوفسکی نے ترتیب دی ہے۔“ امام نے مورین کو سمجھایا۔

”کہانی غیر معمولی نہیں ہے۔ ایک شہزادہ وہاں کی ہدایت پر خود مختار زندگی گزارنے کے تجربے کے لیے جنگلوں میں نکل گیا تھا۔ جہاں اس کی ملاقات ملکہ ہنس سے ہوئی اور وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔“ مورین غور سے امام کی بات سن رہی تھی۔

”لیکن تم باقی کہانی شو میں دیکھنا۔ میں اسے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔“ اس کا کمال یہ ہے کہ بار بار دیکھ کر بھی جی نہیں بھرتا۔ اس کی روح پرور موسیقی اور کوریوگرافی کی کہانی کی جزئیات سے بھرپور مطابقت ہے۔ اچھا چلو اپنی ڈرنک ختم کرو۔ لوگ ہال میں جانا شروع ہو گئے ہیں۔“ مورین نے جلدی سے پیالی کو اپنے اندر انڈیلا اور پرس لے کر کھڑی ہو گئی۔ امام مسکرا رہا تھا۔ اس کی معصومیت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

پال کلے میں بہت تنوع تھا۔ پکاسو میں بھی تھا۔ دونوں جینئس تھے۔ ان کا فن ان کے مشاہدے اور تجربے کا احیا تھا۔ فکر کی وراثت۔ کلے نے کہا تھا فن ظاہر کی باز تخلیق نہیں کرتا، وہ ظاہر کی تخلیق کرتا ہے۔

گیلری میں امام پال کلے کی تصویر دیکھ کر کچھ دیر کو رکا تھا۔ وہاں عمودی اور متوازی رنگوں کی پٹیوں اور رنگوں کے امتزاج سے شمالی فرانس کا ساحلی منظر تھا۔ لیکن اس کے ساتھ جو تصویر تھی وہ ایک دم مختلف تھی۔ وہاں کچھ پیکر سایے کے پرتو نظر آ رہے تھے لیکن اس کے پیچھے وہی وہم تھا جو پہلی میں تھا۔ فن کار کی کوئی پہچان نہیں بن رہی تھی۔ مصور کی جبلی کیفیت، مشاہدے کا ارتکاز۔

امام نے مورین سے کہا تھا کہ وہ اگلے ہفتے اس سے نہیں مل پائے گا۔ اسے اپنی دو تصویریں مکمل کرنی ہیں۔ کمرشل گیلری کے کیوریٹر کا فون آیا تھا کہ اس کے پاس کچھ خریدار ہیں۔ امید ہے تصویریں بک جائیں گی۔

”مجھے لائبریری بھی جانا ہے۔ میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھو میں فارغ ہوتے ہی تمہیں فون کروں گا۔“ اس نے مورین سے رخصت ہوتے ہوئے اپنی توجہ کا یقین دلایا تھا۔

امام دو روز سے اپنے دن کا بہت سا حصہ لائبریری میں گزار رہا تھا۔ اس نے پال کلے کے بارے میں بہت کچھ جان

لیا تھا۔

پال کلے سوئٹزرلینڈ میں پیدا ہوا۔ زندگی کا زیادہ حصہ میونخ میں گزارا۔ سفر نے اس کے فن کو نئی سمت دی تھی۔ تیونس کے سفر میں وہاں کی گہری روشنی سے مغلوب ہوا۔ اٹلی کے سفر سے لوٹا تو اس نے جو وہاں موزیک دیکھا تھا وہ اس کی تصویروں میں منعکس ہونے لگا۔ کہتا تھا میں جب تصویر بناتا ہوں تو میرے گردوپیش کی ہر شے غائب ہو جاتی ہے اور میرا کام پیدا ہوتا ہے جیسے کہ وہ خلا سے آیا ہو۔ پال کلے کے ہاں رنگوں کا رچاؤ ہے۔ موٹلس میں ہم آہنگی ہے۔ "رنگوں نے مجھ پر قابو پا لیا ہے۔ اب میں ان کا تعاقب نہیں کرتا میں اور رنگ ایک ہیں۔ میں مصور ہوں۔"

"اگر مجھے پتہ بھی معلوم ہوتا کہ تم پیانو بجاتے ہو تو بھی تمہاری تصویروں کے ردھم کو محسوس کر لیتا۔" رلکے نے کلے کو لکھا تھا۔

امام پچھلے کئی روز سے مورین سے نہیں مل پایا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ خفا ہو گی۔ فون کیا۔ ملنے کا وقت اور جگہ بتائی تو وہ فوراً راضی ہو گئی۔ موسم شدید سرد تھا۔ صبح سے بارش ہو رہی تھی۔ امام کیفے میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ کیفے کے بند دروازے کے باوجود بادل کی گرج سنائی دے رہی تھی۔ اس نے بیرے کو اشارے سے بلایا اور ایک وسکی کا آرڈر دیا۔ باہر سڑک پر پانی اڑاتی ہوئی گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ کچھ لمحوں بعد کوئی شخص چھتری تانے گزرتا دکھائی دیتا۔ امام کو یقین ہو چلا تھا کہ مورین نہیں آ سکے گی۔ اتنے میں کیفے کے دروازے کے کھلنے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ "او مورین۔" وہ رین کوٹ کی ہڈ اتار کر آگے بڑھی۔

"آئی ایم سوری۔ تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ موسم بہت خراب ہے۔" مورین نے اپنا رین کوٹ ہینگر پر ڈال دیا۔ وہ سردی سے ٹھٹھر رہی تھی۔ امام نے پوچھا۔ "کافی"

"نہیں میں برانڈی لوں گی۔ میں بھیگ رہی ہوں۔" دونوں نے ایک دوسرے کو ان دنوں کی باتیں بتائیں جب وہ نہیں ملے تھے۔ "تم اپنے کام میں لگے رہے ہو گے۔ کیا تمہاری تصویر مکمل ہو گئی۔ میں تو میوزک سنتے ہوئے بستر میں لیٹ کر مزا ینڈ بوز پڑھتی رہی۔ تم نے بہت دن بعد فون کیا۔ ماما بھی حیران تھی کہ میں اتنے روز سے گھر میں کیوں گھسی بیٹھی ہوں۔"

"ہاں تصویر مکمل ہو گئی تھی اور وہ بک بھی گئی۔"

"گریٹ"

''موریں، میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔''

''کیا؟ کہیں جا رہے ہو۔ کوئی اور ضروری کام پڑ گیا۔ تم نے کہا تھا کہ فرانس جانا چاہتے ہو۔ بھائی کا خط آیا تھا۔''

''ارے، تم رکو تو کچھ کہوں۔ دل سے گھڑی ہوئی باتیں کیے جا رہی ہو۔''

''کیا پھر ...''

''دیکھو کیفے میں بہت لوگ ہیں۔ کان ادھر کرو۔'' امام نے موریں کو سرگوشی میں کہا۔ ''کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟''
پیشتر اس کے کہ موریں کے منہ سے چیخ نکلے۔ امام نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ مارے خوشی کے موریں کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

''تم جلدی میں کوئی فیصلہ نہ کرنا۔ میں چند روز کے لیے رضا بھائی کے پاس فرانس جا رہا ہوں۔ اس دوران تمھیں سوچنے کے لیے وقت مل جائے گا۔'' امام نے دھیمے لہجے میں کہا۔ موریں خلا میں دیکھ رہی تھی۔ وہ متذبذب تھی کہ امام کی پیشکش پر کیا کرے۔ اس سے کیا کہے۔ وہ اسے چاہتی تھی لیکن یہ ایک بڑا اقدام تھا۔

بہت روز بعد انگلینڈ کی ابر آلود فضاؤں سے نکل کر امام کو فرانس کی روشنی بہت مسحور کر رہی تھی۔ وہ رضا اور ان کی فرانسیسی بیوی سے مل کر بہت خوش تھا۔ رضا کا گھر پیرس کے مضافات میں تھا۔ وہ میزبانی اور گرد و پیش کے دلفریب ماحول سے سرشار ہو رہا تھا۔

تقسیم کے وقت جب سید حیدر رضا کے بہن بھائیوں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تو رضا کا حتمی فیصلہ تھا کہ وہ ہندوستان نہیں چھوڑنا چاہتے۔ وہ بمبئی میں خوش ہیں۔ بمبئی رہیں گے۔ رضا اپنی مصورانہ سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ انھوں نے بمبئی میں اپنے دیگر مصور ساتھیوں کے ساتھ مل کر بمبئی پروگریسو گروپ تشکیل دیا تھا۔ یہ ایک تحریک تھی جس نے ہندوستانی آرٹ کو انگلستان کی حقیقت نگاری کے اثرات سے نکالا اور ہندوستانی وژن اور تجریدیت کو فروغ دیا۔ اسی دوران ان کے اپنے اسلوب میں نمایاں تبدیلی آئی اور انھوں نے لینڈ اسکیپ کو چھوڑ کر مائنڈ اسکیپ بنانا شروع کر دیں۔

''ہاں بھئی سید، کیسے ہو۔ ارے ان تمام برسوں میں تم ایک سنجیدہ مرد بن گئے ہو۔ اچھا ہوا تم آ گئے۔ بہت ہی جی چاہ رہا تھا تم سے ملنے کو۔''

"جی بھائی جان، میں جب بھی آپ کے پاس آنے کا پروگرام بناتا تو کوئی کام آ پڑتا۔ ان دنوں کچھ فرصت تھی۔ دیکھیں چلا آیا۔"

"کچن سے ژاناں نے آواز دی۔ "تم لوگ کھانا کب تک کھاؤ گے تاکہ میں اوون کا حساب رکھوں۔""

"تم جب کہو، ہم تیار ہیں۔" رضا نے محبت سے جواب دیا۔

رضا فرانسیسی حکومت کے اسکالرشپ پر پیرس آئے تو تعلیم کے دوران ژاناں سے ملاقات ہوئی۔ ژاناں کی ماں نے اپنی بچی کا ہاتھ رضا کو دیتے وقت یہ فرمائش کی تھی کہ وہ کبھی فرانس نہیں چھوڑے گا۔

"سچ پوچھو تو ژاناں میری پہلی محبت نہیں ہے۔"

امام نے حیرت سے بھائی کو دیکھا۔

"میں فرانس آتے ہی اس کے دیہی علاقوں کے مرغزاروں اور انوکھے آرکیٹیکچر کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ میں نے ان مناظر پر ایک سیریز بنائی تھی۔ وہ دیکھو سامنے۔" رضا نے اسٹوڈیو کی دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ سامنے ایک گرجے کی مرتعش تصویر تھی جو بکھرے ہوئے نیلے آسمان سے گھرا ہوا تھا۔

"یہ ان میں سے ایک ہے۔ ژاناں کی ماں میرے یہاں رہنے پر اصرار نہ بھی کرتی تو میں یہیں کا ہو گیا تھا۔ لیکن یار، میرے دل کا ایک ٹکڑا ابھی بھی ہندوستان میں بستا ہے۔"

"چیئرز۔ چیئرز ٹو انڈیا۔" رضا نے وائن کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

امام نے کہا۔ "چیئرز ٹو پاکستان آلسو۔"

"ہاں، چیئرز ٹو پاکستان۔" رضا یکدم اداس ہو گیا تھا۔ "تم لوگ جب ہندوستان سے چلے گئے تو میں بہت اکیلا ہو گیا تھا۔ میں تقسیم کے موقع پر ہونے والی خونریزی پر دکھی تھا۔ میں نے "بارامولا کی رہائی" اسی موضوع پر بنائی تھی۔"

کچھ دیر کو دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔

"میں اگلی بار ہندوستان گیا تو پاکستان ضرور آؤں گا۔ یوسف بھائی، حسن اور آپا سے ملے ہوئے زمانہ ہو گیا ہے۔" رضا نے خاموشی کو مزید گہرا ہونے سے بچایا۔

سوزین نے بیکر اسٹریٹ پر واقع اپنے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے جھانکا۔ بارش اور سردی سے شیشوں پر بھاپ جم گئی تھی۔ اس نے شیشے کو صاف کیا۔ سامنے سے ایک اوپل ریکارڈ گزر رہی تھی۔ ملک مین کی سائیکل کا پہیہ پنکچر ہو گیا تھا۔ وہ دودھ کی

ننھی بچوں کو کرینٹ زمین پر رکھے پریشان بیٹھا تھا۔ امام سے شادی کے بعد اس کا زیادہ تر وقت گھر پر گزرتا تھا۔ میٹرک گریجویشن کرنے کے بعد اس نے ایک دفتر میں ریسپشنسٹ کی نوکری کر لی تھی۔ شادی کے بعد وہ جاب اس لیے چھوڑ دی کہ دفتر بہت دور پڑتا تھا۔ اس نے اخبار کے اشتہارات دیکھ کر چند ایک درخواستیں ڈالی تھیں لیکن ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ امام کی خواہش تھی کہ وہ کام کرنے لگے تاکہ مصروفیت رہے۔ وہ باقاعدگی سے آرٹ اسکول جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اسپتال میں پارٹ ٹائم کام کرتا تھا۔ کچھ تصویریں بک جاتی تھیں اس لیے مالی طور پر مستحکم تھا کہ گھر کی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ ویک اینڈ پر مورین کے ساتھ تھیٹر یا کوئی فلم دیکھ سکے۔ زندگی معمولات سے نباہ کر رہی تھی۔

گھنٹی بجی تھی۔

''ارے امام آج جلدی لوٹ آئے۔ وہ کہہ کر گیا تھا کہ وہ ایک دوستوں سے ملنا ہے مجھے دیر ہو جائے گی۔ پریشان نہ ہونا۔''

''سب ٹھیک ہے نا۔''

''ہاں ہاں۔ کیوں۔''

''ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔ وہ یہ کہ سوچا آج تم دوستوں کے ساتھ کھانا کھا کر آؤ گے۔ اس لیے میں نے کچھ پکایا نہیں۔''

''فکر نہ کرو۔ میں کھانا لے آیا ہوں۔'' امام نے ٹیک اوے کا پیکٹ مورین کو تھمایا۔ ''ہاں ویک اینڈ پر کچھ دوست آئیں گے۔ گروسری دیکھ لینا۔ کوئی چیز کم ہو تو بتا دینا۔ وہ لوگ ہفتے کی شام کا کھانا کھائیں گے۔''

''اگر کچھ چاہیے ہوگا تو میں لے آؤں گی کتنے لوگ ہوں گے۔''

''دو یا تین'' یہی ایک آرٹسٹ دو آرٹ کریٹک۔ بھلا ہمارے گھر اور کون آئے گا۔ تمہیں معلوم ہے میرے دوستوں کا حلقہ محدود ہے۔''

''آئی لو بیوٹی فول ویٹ۔ یہ لوگ کسی اور دنیا میں بستے ہیں۔ وہ جو ان کی اپنی دنیا ہے۔'' مورین دل میں سوچ رہی تھی۔

امام کے ساتھ رہتے ہوئے مورین نے ایک نئے طرز زندگی کو دریافت کیا تھا۔ وہ سب کچھ جاننا تھا جو اسے اپنے والدین کے گھر میں رہتے ہوئے کبھی معلوم نہ ہو پاتا۔ ان کے ساتھ زندگی آرام دہ تھی۔ پاپا اخبار پڑھتے رہتے۔ ماما گھر کے کام سے فارغ ہو کر چمڑے کی کرسی میں دھنس کر ٹی وی پر سوپ اوپراز دیکھتی۔ مورین کو بیکر اسٹریٹ پر رہنا اس لیے بھی اچھا لگتا تھا کہ یہاں شرلاک ہومز اور ڈاکٹر واٹسن رہتے تھے۔ وہ کبھی بور ہوتی تو پیدل دور تک نکل جاتی۔ مایوسی بھی ہوتی کہ اسے گلی کے وہ چھوکرے کہیں نظر نہیں آتے تھے جو شرلاک ہومز کے لیے مخبری کرتے تھے۔ اب وہاں وہ بگھیاں بھی نہیں تھیں جنہیں گھوڑے کھینچتے تھے۔

مورین کو دوسرے کمرے سے آوازیں آ رہی تھیں۔

"ڈاڈاازم دراصل جنگ کے خلاف احتجاج تھا۔ چونکہ جرمنی اس سے شدید متاثر ہوا تھا تو ڈاڈاازم کی تحریک زیورک میں شروع ہوئی تھی۔"

"ڈاڈا کس زبان کا لفظ ہے۔"

"یہ واضح نہیں ہے لیکن فرانسیسی میں اس کا مطلب کھلونا گھوڑا ہے جبکہ بعض زبانوں میں اسے بطور بچگانہ باتوں سے مراد لی جاتی ہے۔ ڈاڈاازم کی تحریک میں مصوروں کے علاوہ ادیب بھی شامل تھے۔ یہ لوگ مختلف انداز اور مختلف صورتوں میں مادہ پرستی، قومیت پرستی اور انفرادیت پرستی پر تھوکتے تھے۔"

"جنگ کی تباہ کاریاں لوگوں کے گھروں کے بیرونی صحن تک پہنچ گئی تھیں۔ یہ ردعمل ناگزیر تھا۔ اس کی ایک توجیہ یہ تھی اگر معاشرہ انسانی تباہی کی طرف جا رہا ہے تو ہم اپنی اقدار یا اصولوں پہ کیوں کاربند رہیں۔"

"ڈاڈاازم کا ایک ہی اصول تھا کہ کسی اصول کی پیروی نہ کرو۔" ڈاڈاازم میں وہ کچھ آرٹ تھا جو آرٹ نہیں تھا۔

"ایک رائے یہ بھی تھی کہ درحقیقت یہ کوئی تحریک نہیں تھی۔ اس کے فن کار فن کار نہیں تھے۔ اس کا فن کوئی فن نہیں تھا۔"

"کچھ بھی کہہ لیں لیکن ڈاڈاازم نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ یہ سب ریکارڈ پہ موجود ہے۔"

مورین کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرہ پائپ، سگریٹ کے دھوئیں اور وہسکی سے مہک رہا تھا۔ پس منظر میں شوپاں کی موسیقی بج رہی تھی۔ امام کے مہمانوں نے مورین کو دیکھ کر تعظیماً کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ امام نے تعارف کروایا۔

"نائس میٹنگ یو، پلیز آپ بیٹھیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں۔"

"ہاں، ہمیں کچھ برف چاہیے۔ دیکھو کیا سوڈے کی اور بوتلیں ہیں۔ فرج کے ساتھ سائیڈ بورڈ پہ دیکھ لینا۔" امام نے شوہرانہ انداز میں کہا۔

مورین کچھ دیر کو وہاں رکی۔ وہ لوگ جو باتیں کر رہے تھے وہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ وہ معذرت کر کے وہاں سے اٹھی اور دوسرے کمرے میں دھیمی آواز میں ٹی وی پہ کوئی فلم دیکھنے لگی۔

O

امام نے بار کے کاؤنٹر کے اسٹول پہ بیٹھتے ہوئے لکڑی کے فرش پہ رقص کرنے والے جوڑوں کو دیکھا۔ وہ مورین کے ساتھ اکثر اس پب میں آتا تھا۔ وہ آج اکیلا تھا اور بہت دنوں بعد یہاں آیا تھا۔

بارٹینڈر نے کپڑے سے گلاس کو رگڑتے ہوئے روشنی میں اسے بغور دیکھا۔ صاف ہو گیا تھا۔ کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکائے گاہک کو دیکھ کر متوجہ ہوا۔

''یس سر۔ میں کیا پیش کروں۔''

''وہسکی سوڈا۔''

''یس سر۔''

بارٹینڈر اپنے معمول کے گاہکوں کو پہچانتا تھا۔ اسے اکیلا دیکھ کر یہ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکا کہ آپ کی بیوی کہاں ہے۔

''سر آپ کیا کہیں چلے گئے تھے۔''

''ہاں۔ میں گھومنے نکل گیا تھا۔ تھینک یو، مجھے یاد رکھنے کا شکریہ۔''

امام نے سگریٹ جلایا۔

اس شام جب وہ گھر آیا تو مورین کچھ کھوئی کھوئی تھی۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پی رہی تھی۔

امام نے پوچھا۔ ''کیا کوئی پریشانی ہے۔''

''پہلے تم وعدہ کرو کہ تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو گے۔''

''اوکے وعدہ۔''

''لک، میں نے تم سے اپنی مرضی سے شادی کی تھی۔ تم ایک اچھے انسان ہو۔ اچھے شوہر بھی۔''

''پھر مسئلہ کیا ہے۔''

''میں نے تمہارا ساتھ نبھانے کی بہت کوشش کی۔ کسی نہ کسی طور یہ دو سال گزر گئے۔ تم نے میرا بہت خیال رکھا۔ میری ہر خواہش پوری کی۔''

''تو؟''

''لیکن اب یہاں میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ آئی لو یو۔ لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ تمہاری زندگی آرٹ کے گرد گھومتی ہے۔ تم آرٹ کی باتیں کرتے ہو۔ آرٹ میں سانس لیتے ہو۔ یہ سب بہت اچھا ہے۔ انوکھا ہے، لیکن میں تمہاری ذہنی سطح تک نہیں پہنچ سکتی۔ میں ایک معمولی عورت ہوں اور عام لوگوں کی طرح رہنا چاہتی ہوں۔''

امام مورین کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے سگریٹ جلایا اور اپنے لیے ڈرنک بنانے کے لیے اٹھا۔ مورین سے پوچھا کہ وہ

کیا لے گی۔

"میں بیئر لوں گی۔" مورین نے اپنے آنسو روکتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

امام بہت پرسکون تھا۔ اس نے کوئی دلیل نہیں دی۔ کوئی جواز پیش نہیں کیا۔

برف کے سفید سفید نوکیلے ریزے کھڑکی کے شیشوں کے ساتھ چپک گئے تھے۔

"وان مور" امام نے بارٹینڈر سے کہا۔

اب کاؤنٹر کے دوسرے اسٹول پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ امام اپنے دھیان میں گم رہا۔ وہ گزشتہ چند ماہ کے دوران اپنی مشکل زندگی کی بازیافت کو مٹا تا رہا تھا۔ وینس کے گنڈولوں پر گیٹار سنتے ہوئے، روم کے پیازاؤں کے فواروں کی پھوار کے جلترنگ سے محظوظ ہوتے ہوئے، پیرس کے لاطینی کوارٹرز کے ہپیوں کے بے سرے الاپ سنتے ہوئے۔

وہ خوش تھا کہ مورین کے ساتھ علیحدگی خوش اسلوبی سے طے پا گئی تھی۔ اس نے مورین سے کہا تھا کہ اس گھر سے تم جو چاہو لے جا سکتی ہو۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ مورین نے آخری بار جاتے ہوئے اپنی خاموش آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جیسے کہ آئی ایم سوری۔ میری مجبوری تھی۔

"ایکسکیوزمی" امام کو اپنے قریب سے آواز آئی۔

"کیا تم میرے ساتھ ڈانس کرو گے۔"

"او" امام چونکا تھا۔ "شیور" وہ اپنا گلاس کاؤنٹر پر چھوڑ کر اٹھا۔ ہاتھ بڑھا کر پیشکش کو قبول کیا۔

"میں لیزلی ہوں۔"

"میں ....ہوں۔"

"اسٹوڈنٹ ہو؟"

"ہاں میں آرٹ اسٹوڈنٹ ہوں۔ ایک پینٹر۔"

موسیقی کی دھنوں پر ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھے وہ دونوں سرگوشیوں میں اپنا تعارف کروا رہے تھے۔

اب وہ دوبارہ بار کاؤنٹر پر آ بیٹھے تھے۔

"تھینک یو۔" لیزلی نے کہا۔

"ویلکم" امام نے دونوں کے لیے ڈرنکس کا آرڈر دیا۔

"کیا تم شادی شدہ ہو۔" لیزلی کا سوال تھا۔

"معلوم نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"یعنی میری اپنی بیوی سے علیحدگی ہو چکی ہے۔ اور تم؟"

لیزلی نے ہنستے ہوئے کہا۔ میری ماں نے کبھی شادی نہیں کی۔ میں بھی اس پر کاربند ہوں۔ شادی وغیرہ میرے بس میں نہیں۔ کسی کے ساتھ تعلق جوڑنا چاہو تو تم آزاد ہو۔ تعلق توڑنا چاہو تو بھی تم آزاد ہو۔ شادی کرنے میں بہت سے جھگڑے ہوتے ہیں۔"

امام اس کی باتیں بغور سن رہا تھا۔

وہ گھر لوٹا۔ اس نے اپنے اپارٹمنٹ کی تاریکی کو بجلی کی روشنی سے دور کیا۔ وہ صبح جانے سے پہلے اپنے لیے دال بنا کر گیا تھا۔ واپسی پر کچھ نان لے آیا تھا۔ یورپ کے سفر کے دوران ادھر ادھر کے مختلف علاقوں کے کھانوں اور مشروبات کے ذائقوں کے بعد آج اسے خالص دیسی کھانے کی خواہش ہو رہی تھی۔ اس نے دال کو پیاز کا بگھار لگایا اور نان کو اوون میں گرم کرنے کے لیے رکھ دیا۔

"آدمی آزادی پانے پر مجبور ہے۔ ہر طرح کی پابندی سے آزادی۔ ممکن ہے وہ اس آزادی سے گریز کرے، انکار کرے یا بھاگنے کی کوشش کرے۔ لیکن ایسا اسی وقت ممکن ہے جب وہ اس کا سامنا کرنے کی جرأت رکھتا ہو کہ وہ ایک باوصف انسان ہے۔ جب یہ آزادی مسلمہ ہو جائے تو پھر انسان کو دنیا میں اپنے کردار کی ادائیگی کا عہد کرنا ہوگا لیکن آدمی کی آزادی کی کمٹمنٹ کی کوشش، دوسروں کی حمایت کے بغیر ناکام ہو جاتی ہے۔"

وہ ان دنوں سارتر کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بہت روز بعد مورین کا فون آیا تھا۔ وہ ملنا چاہتی تھی۔ امام کچھ کنفیوژن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسے مورین کے ساتھ گزارے ہوئے دن اچھے لگے تھے، لیکن اس نے علیحدگی کے بعد بہت سے لمحے، اپنے آپ کے ساتھ، اپنی خودمختاری کے

ساتھ، بہت خوش گوار انداز میں بسر کیے تھے۔ وہ ریاضت نہیں کرتا پایا جاتا تھا۔

موریں آئی۔ وہ نفیس لیموزین میں بہت با اعتماد لگ رہی تھی۔ اس کی آواز میں دھاتی کھنک تھی۔

"مجھے طلاق چاہیے۔" یہ امام پر براہ راست وار تھا۔

"او کے۔ ڈائن تم طلاق کے کاغذات تیار کروا لو۔ کیونکہ یہ تمہارا مطالبہ ہے۔"

"یس۔ میرا وکیل تم سے فون پر بات کرے گا۔"

وہ چلی گئی۔

وکیل کہہ رہا تھا۔ "طلاق صرف اس وقت ہو سکتی ہے جب اس کی کوئی ٹھوس وجہ بتائی جائے۔"

"موریں نے خواہش کی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے جانا چاہتی ہے۔ میری طرف سے تو کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔" امام منمنایا۔ "میں نے اس پر تشدد نہیں کیا۔ اس کے آرام اور تمام ضرورتوں کا خیال رکھا۔"

"وہ اس بات کو تسلیم کرتی ہے۔ لیکن وہ طلاق لے کر آزاد ہونا چاہتی ہے۔ طلاق کے لیے سب سے ٹھوس وجہ یہ ہے کہ عدالت کو بتایا جائے کہ تم زنا کاری کے مرتکب ہوئے ہو۔"

"میں۔ میں ایسا نہیں ہوں۔ یہ جھوٹ ہے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ یہ محض بہتان ہے لیکن تم نے موریں کے ساتھ اچھا وقت گزارا ہے اس کی مدد کرنے کے لیے یہ بہتان تمہیں اپنے سر لینا ہوگا۔"

"لیزلی" امام کے ذہن میں خیال کوندا۔ شاید وہ مان جائے، ابھی تک اس کے ساتھ محض جان پہچان تھی۔ نہ جانے وہ اس کا کتنا معاوضہ مانگے۔ اس کی تمام جمع پونجی سپروسٹر میں خرچ ہو چکی تھی۔

لیزلی نے اس کی بات سن کر زور سے قہقہہ لگایا۔ "فکر نہ کرو، جس دن عدالت جانا ہو، مجھے پہلے سے بتا دینا۔"

آئندہ سال میں عدالت کی پیشیوں کی تعداد خاصی تھی۔ موریں امام سے آزاد ہو گئی تھی۔ امام کو قانون کے مطابق اپنی سابقہ بیوی کو اس وقت تک خرچہ دینا تھا کہ جب تک کہ وہ دوسری شادی نہ کر لے۔

لیزلی نے امام کو بھرپور رفاقت دی تھی۔

8 سال گزر گئے۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی۔ بہت سی اچھی بری خبریں مل رہی تھیں۔ امام نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ پاکستان لوٹ جائے گا۔ لیزلی اس کی عادت سمجھ چکی تھی۔

لیکن بہت سے سوالوں کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ لیزلی نے اس کی بات سن کر انکار کر دیا۔

''میں وہاں جا کر کیا کروں گی۔''

امام کے لیے یہ غیر متوقع جواب تھا۔ انگلینڈ میں دس سال کے قیام کو سمیٹنے میں کچھ دن لگ گئے۔ لیزلی کی وفا شعاری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ایک دن اس نے کہا۔

''امام۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں اور تمہارے ساتھ پاکستان جانے کو تیار ہوں۔''

امام خاموش رہا۔

''کیا سوچ رہے ہو، تم نے سنا کہ میں نے کیا کہا ہے؟''

''سن لیا۔ تم نے جو پہلے کہا تھا وہ بھی سچ تھا۔ دیکھو حقائق کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ تمہارے لیے پاکستان کے گھر سے نباہ کرنا مشکل ہو گا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں مالی طور پر مستحکم نہیں ہوں۔ ہم دونوں کے لیے یہی اچھا ہے کہ اس ناطے کو یہیں پر ختم کر دیں۔ خوش اسلوبی سے۔ ایک دوسرے سے بدظن ہوئے بنا۔

امام نے ائرپورٹ جانے کے لیے ٹیکسی روکی۔ سامان رکھا۔ پلٹ کر دیکھا۔ لیزلی کا سوٹ کیس فٹ پاتھ پر اس کے پاؤں سے چھوٹ رہا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب سے گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ لیزلی ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ کس طرف جانے والی گاڑی کو رکنے کا اشارہ دے۔

7

یوسف رضا شام کو فیڈرل بی ایریا کے علاقے عزیز آباد میں اپنی رہائش گاہ کی طرف جاتے ہوئے گلی کی نکڑ پر پھل والے کی ریڑھی کے پاس رک گئے۔ انہوں نے پانچ کلو لنگڑے آم خریدے اور تھیلا ہاتھ میں لئے گھر میں داخل ہوتے ہی آواز دی۔

''سید'' کوئی جواب نہ ملا۔

اتنے میں سامنے سے آتی ہوئی اپنی بیٹی ناہید کو دیکھا تو پوچھا۔ ''سید گھر پر نہیں ہے کیا۔''

''ابو، انکل تو آج صبح ہی نکل گئے تھے۔ امی کو بتا رہے تھے کہ کچھ دوستوں سے ملنا ہے۔ شاید دیر سے لوٹوں۔''

''ارے۔ میں تو اس کے لیے آم لایا تھا۔ کہہ رہا تھا پچھلے کئی برسوں سے آم نہیں کھائے۔ چلو رات کو آئے گا تو کھالے گا۔ لو۔'' انہوں نے تھیلا ناہید کی طرف بڑھایا۔ ''انہیں دھو کر برف کے پانی میں ڈال دو۔ ٹھنڈے ہو جائیں گے۔''

''سید ابھی تک یہاں جم نہیں پا رہا۔'' یوسف نے دل میں سوچا۔ ''کبھی کہتا ہے لاہور چلا جاؤں گا۔ شاید واپس انگلینڈ چلا جاؤں۔ چلو ٹھیک ہے۔ جو اسے اچھا لگے گا کرے گا۔'' علی امام کے پاکستان لوٹنے پر یوسف دل ہی دل میں بہت خوش تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ دوسرے بھائیوں کی طرح سید بھی ملک سے باہر قیام کرے۔

پاکستان ابھی بھارت سے جنگ کے بعد کے اثرات سے نبرد آزما ہو رہا تھا۔ کہنے کو تو ہم نے یہ جنگ جیتی تھی لیکن یہ جیت بہت سے جانی اور مالی نقصانات کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ ریڈیو پر بجنے والے نغمے ''اے وطن کے سجیلے جوانو۔'' ''جیوے، جیوے، جیوے پاکستان'' عوام کی بگڑتی ہوئی اقتصادی حالت سنوارنے سے قاصر تھے۔ چوکوں پر جنگ کے دوران گرائے گئے تباہ شدہ بھارتی فضائیہ کے طیاروں کے ڈھانچے دل کو گرماتے تھے اور نہ ذہن کو روشن کرتے تھے۔ ایک تاسف تھا کہ ایسا نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

انگلینڈ میں امام نے بھارتی جرنیل کا جب یہ بیان پڑھا کہ وہ لاہور کو فتح کرکے جمخانہ میں جام نوش کریں گے تو اس کا

دل تڑپا تھا۔ ہندوستان میں اس کے والدین کی قبریں تھیں۔ لاہور میں اچھے دنوں کی بہت سی یادیں تھیں۔

کیفے میں باتوں کی بھنبھناہٹ رہتی تھی۔ بہت سی باتیں ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ میزوں کے گرد چائے اور ٹھنڈی مشروبات کو حلق سے اتارتے ہوئے بہت سی آرائیں، جن میں سے کسی ایک کی تان اونچی ہوتی۔ اس کی بات اردگرد کے لوگوں کو متوجہ کرتی۔ نظریں اس طرف بڑھتیں، گردنیں مڑنے لگتیں۔

''تم میری بات کا یقین کرو، فیلڈ مارشل کی آمریت کا یہ آخری دور ہے۔''

''کہتا تو یہی ہے۔ لیکن آمر آسانی سے اقتدار نہیں چھوڑتے۔''

''دیکھ لینا فاطمہ جناح کو الیکشن میں ہروا کر ایوب خان خود ہار گیا ہے۔ عوام اندر ہی اندر سلگ رہی ہے۔''

امام نے سیاست پر یہ گرما گرم بحث بہت عرصے بعد سنی تھی۔ اچھا لگ رہا تھا۔ پسماندہ ملکوں کے غریب لوگ، اچھے دنوں کی آس میں دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں رہنے والے اپنی آسائشوں کو سمیٹتے ہوئے اپنے آپ میں گھس جاتے ہیں۔

''ایوب خان نے تاشقند معاہدے پر نہیں، اپنے زوال کے پروانے پر دستخط کیے ہیں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن ہمارے ہاں لیڈرشپ نہیں ہے۔ سیاسی پارٹیوں یا اسٹوڈنٹس یونینز کی جانب سے جمہوریت کی آواز اٹھتی ہے تو انجام جیل ہوتی ہے۔ کتنے اسٹوڈنٹس لیڈر اور سیاسی کارکن اس وقت بھی حراست میں ہیں۔

کراچی کا ثقافتی منظر خالی خالی دکھائی دیتا تھا۔ امام اس شہر سے زیادہ واقف نہیں تھا۔ ہندوستان سے آنے کے بعد اس کا زیادہ تر وقت پنجاب کے مختلف حصوں میں گزرا تھا۔ کراچی ملک کا بڑا شہر تھا۔ ایک متنوع مزاج کا کاسموپولیٹن شہر، جس کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔ جہاں تضادات کے تصادم کا عنصر ایک خدشے کی طرح ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔ لیکن بہت سی اکائیاں مل کر ایک خوش رنگ امتزاج بناتی ہیں۔ اس لیے شہر کو نووارد تجسس کو اپنے ساتھ لے لیتا ہے۔ وہ مواقع اور امکانات کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔

سردست وہاں ایسا کچھ نہیں تھا جس سے وہ اپنے گزشتہ دس برسوں کے وسیع مشاہدے، مطالعے اور تجربے میں کسی کو شریک کر سکے۔

کراچی میں بننے والی تصویر روایتوں سے جڑے رہنے کے فرسودہ حصے میں منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ مصور نئے تجربے کرنے اور نئی جہتیں اپنانے سے گھبرا رہا تھا۔ اس کے نزدیک یہی چیز اس کی ثقافت کی نمائندگی کرتا تھا۔ غزالی آنکھوں والی،

دل ربائی سے سرشار عورت کے چہروں کے جھکے اور گردن کے بار مصوری کی تخلیق کی انتہا تھی۔ اگر کچھ علامتی پیش کرنے کی کاوش ہوئی تو محفل کے مرکز میں صراحی کوزوں سے گھری ہوئی تھی۔ عورت تماش بینوں کے نرغے میں۔ یہ عورت کی توقیر نہیں تحقیر تھی۔ یہی کچھ شہر کے نامور مصوروں کی تخلیق تھی۔

امام کو یہ سب بہت مایوس کن لگ رہا تھا۔

انفنسٹن اسٹریٹ کی بڑی سی کراکری شاپ کے سامنے کچھ فریم کی ہوئی آئل پینٹنگز فٹ پاتھ پر رکھی رہتی تھیں۔ یہ بوہری بازار کی گفٹ شاپ کے شوکیسوں میں چینی اور پلاسٹر آف پیرس سے بنائے گئے مجسمے اور گلدان پڑے تھے۔ گھر کی آرائش کا سامان۔ خریدار کے پاس کوئی چوائس نہیں تھی۔ نہ ہی اسے یہ شعور تھا کہ وہ کسی تخلیق کار کی تصویر کو سمجھے اور اسے اپنانے کی خواہش کرے۔

امام نے کینوس پر نائف سے ایک اسٹروک لگایا۔ کچھ دیر اسے دیکھا۔ اطمینان نہ ہوا۔ بھورے رنگ میں سفید رنگ کی آمیزش کی۔ اسے امیج کے دائیں طرف کی خالی جگہ پر بکھرا۔

وقت بہت آگے نکل چکا تھا۔ امام مری کے کوہساروں کے مناظر اور پنجاب کے کھیت مزدوروں کی زندگی کی عکاسی سے بہت آگے آ گیا تھا۔ انگلینڈ میں قیام کے دوران پاکستانی مصوروں کے گروپ کے زیر اہتمام نمائشوں میں یہ ایک طرح سے ضروری تھا کہ اپنے ملک کی ثقافت کی عکاسی کی جائے تاکہ اس کی پہچان بن سکے۔ مگر یورپ کی مصوری کی تحریکوں سے متاثر ہونا بھی ناگزیر تھا۔ امام میں تجربہ کرنے کا حوصلہ تھا۔ وہ شعوری کوشش تھی یا رنگوں، میڈیم اور موضوعات کی تبدیلی، مطالعے اور مشاہدے کا نتیجہ تھا۔

علی امام کی تصویر، جو انہوں نے 1964ء میں انگلینڈ میں قیام کے دوران بنائی تھی۔ تعمیراتی خدوخال کی خوب صورت عکسی کمپوزیشن ہے۔ مینار، گنبد، دروازہ، اسطوانی اور سپاٹ چھتیں۔ اس میں امام نے دو تہذیبوں کو ہم آہنگ کیا ہے۔ یہی ان کی سوچ تھی۔ ارتقائی منازل کو طے کرنے کے لیے اپنی اساسیت کو برقرار رکھتے ہوئے نئی جہتوں کو گرفت میں لانا ضروری ہے۔ اس تصویر کو دیکھ کر پال کلے کے "ڈریم سٹی" کی طرف دھیان جاتا ہے۔ پال کلے کے خوابوں کے شہر میں اجزا ایک دوسرے پر پھیلتے ہیں۔ جبکہ امام کے یہاں ایک ٹھہراؤ ہے۔ استحکام ہے۔ یہ واضح ہے کہ فن کار کی کمٹ منٹ کیا ہے۔ وہ رنگ و نقش سے محض ایک بیان نہیں دیتا۔ وہاں ایک ترغیب ہے کہ وقت کو بدلنا ہے۔ تمہیں بھی بدلنا ہوگا۔ زندگی کے دھارے میں روانی برقرار رکھنے کے لیے۔

موسم گرم اور حد درجہ مرطوب ہو رہا تھا۔ دونوں بھائی آنگن میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔

"کراچی کی ایک اچھی بات ہے کہ شام کو ٹھنڈی ہوا چلنے لگتی ہے۔" امام نے کہا۔ "میں جب لاہور میں تھا تو گرمی کے موسم میں ایک دم حبس ہو جاتا تھا۔ ہوا کا ایک جھونکا تک نہیں آتا تھا۔"

"مجھے اس کا کچھ اندازہ نہیں ہے۔ میں کبھی لاہور میں نہیں رہا۔ ہاں تو کیا ہو رہا ہے۔ کیا تم آرٹس کونسل گئے تھے۔"

"جی بھائی جان۔ دو تین بار گیا ہوں۔ شہر بھر میں وہی ایک جگہ ہے جہاں آرٹ کی کچھ اچھی نظر آتی ہے۔ لیکن بس اصلی اعانی ہے۔ وہاں سے آرٹس اینڈ کرافٹس کے اسکول میں چند مصوروں سے ملا ہوں۔ وہیں پر جمیل نقش اور مقصود علی سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"ہاں۔ دونوں باہنر ہیں۔ مقصود ابھی نو آموز ہے جبکہ جمیل نقش کا کام نظر آنے لگا ہے۔ حاجی شریف کا شاگرد ہے۔"

"او ہو اچھا۔ جمیل نقش سے میری سرسری ملاقات ہوئی ہے۔ کسی روز اس کے ہاں جاؤں گا۔ اس کا کام دیکھوں گا۔"

حاجی محمد شریف کا تعلق پٹیالہ گھرانے سے تھا۔ مصوری اور موسیقی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ حاجی شریف کے دادا اللہ دتہ پٹیالہ ریاست کے دربار سے منسلک تھے اور والد شیخ بشارت اللہ مشہور درباری چتیرے تھے۔ نادر شاہ کے دور میں پہاڑی مصوری کے قدیم اور روایتی اسلوب میں نمایاں تبدیلی آئی اور وہ مصوری کے بڑے دھارے کے قریب ہو گیا۔ حاجی شریف پہاڑی طرز مصوری سے متاثر تھے۔ پنجاب کے زیادہ تر مصور رادھا کرشن کی لازوال محبت کی تصویر کشی کرتے تھے جو کہ ملاپ کی علامت خیال کیا جاتا تھا۔ حاجی شریف کے ہاں کانگڑہ کے اسلوب میں مغل طرز کی اچھی مصوری کا امتزاج نظر آتا ہے۔ انہوں نے مائی تھولوجی کی حکایتوں کی تمثیل میں مغل فن تعمیر کے عناصر کا اضافہ کیا ہے۔ لیکن ان کے ہاں مغل مصوری کی حکمت کے بجائے روحانوی احساسات ملتے ہیں۔

"ہاں سید تمہاری بھابی بتا رہی تھیں کہ تم لاہور جانے کا پروگرام بنا رہے ہو۔"

"جی بھائی جان، میں نے سوچا تھا کہ اگر انگلینڈ واپس نہ گیا تو لاہور کا رخ کروں گا۔ اس شہر سے میری بہت سی اچھی یادیں جڑی ہیں۔"

لیکن کراچی کا یہ مہربان شہر امام کے اندر آہستہ آہستہ رچنے بسنے لگا تھا۔ فضا کی کشادگی، چہروں کی رنگتوں اور لہجوں کا تنوع امام کو کھینچے لیے جاتا۔

"ہاں بھئی، چائے مل رہی ہے کہ نہیں۔" یوسف نے آواز دی۔

امام سوچتے سوچتے دور نکل گیا تھا کہ بھائی کی آواز پر واپس لوٹ آیا۔

"جی بھائی، ایک روز کمیونسٹ پارٹی کے کچھ پرانے دوست مل گئے تھے۔ بہت زور لگا رہے تھے کہ میں پھر انھیں جوائن کرلوں۔ انھوں نے پرسوں ایک میٹنگ رکھی ہے۔ میٹنگ میں تو شاید چلا جاؤں لیکن ——"

"پارٹی میں پھوٹ پڑ چکی ہے۔" یوسف نے امام کی بات کاٹی۔ "اب اس میں دم نہیں رہا۔ اصل بات یہ ہے کہ کچھ لوگ مفاد پرست ہیں۔ ہوا کا رخ دیکھتے ہیں۔"

"اس لیے تو میں ان سے الگ ہو گیا تھا۔"

"ملک کے حالات دن بدن خراب ہو رہے ہیں۔ مارشل لا نے اداروں کو تباہ کیا۔ جنگ سے معیشت بیٹھ گئی ہے۔ اس لیے ایک مضبوط سویلین حکومت کی ضرورت ہے۔"

"لندن جانے سے پہلے جب میں لاہور میں تھا تو ان دنوں تو سویلین حکومت تھی لیکن حالات اس وقت بھی اچھے نہیں تھے۔"

"یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ ہمیں قائد اعظم اور لیاقت علی خان کے بعد کوئی اچھا لیڈر نہیں ملا۔ کچھ لوگ ذوالفقار علی بھٹو کا نام لے رہے ہیں۔ بھٹو ایوب خان کی کیبنٹ میں وزیر خارجہ ہیں۔"

"ہاں میں نے اخبار میں تصویر دیکھی ہے۔ اسمارٹ آدمی ہے۔ لیکن ابھی تک وہ آمر کے ملازم ہیں۔ ایک سیاست دان کو غیر جانبدار ہونے کے لیے عہدے سے دستبردار ہو کر عوام کے پاس جانا چاہیے۔"

"امی کہہ رہی ہیں کہ آپ لوگوں کی سیاست ختم ہو جائے تو اندر آجائیں۔ صحن میں بہت مچھر ہیں۔" نادیہ نے چائے کی ٹرے ہاتھ میں لیے پیغام دیا۔

"تمہاری بھابی کو تمہاری فکر ہو رہی ہے کہ اگر دیور کو مچھر کاٹے گا تو کہیں بیمار نہ پڑ جائے۔"

امام نے قہقہہ لگایا۔ "ارے ہاں، بس ابھی آتے ہیں۔"

کمرے میں ایک تصویر لگی تھی پوچھا تو پتا چلا کہ نادیہ نے بنائی ہے۔ "اچھی واٹر کلر ہے۔"

"امتحان سے فارغ ہو کر وہ یہی کچھ کرتی رہتی ہے۔"

"کالج کب شروع ہو رہے ہیں۔"

"اگست ستمبر میں داخلے ہوں گے۔"

''میرا خیال ہے کہ اسے آرٹس کونسل کے اسکول میں داخل کروا دیں۔ جب کالج کے داخلے شروع ہوں گے تو دیکھیں گے۔ اگر اس میں ایک آرٹسٹ ہوا تو اس کی راہ از خود بن جائے گی۔''

یوسف رضا کو بھائی کی بات معقول لگی تھی۔

''تاریخ والوں کا کہنا ہے کہ فرانس کی ایک غار کی چٹان سے ملنے والے بیل کی قدیم ترین تصویر ہے جو 32000 سال پرانی ہے۔ غاروں کی تصویریں فرانس کے علاوہ انڈیا، اسپین، پرتگال، چین اور آسٹریلیا میں بھی پائی گئیں۔ ان میں گھوڑوں اور شیروں کی شبیہیں تھیں۔ پہلے وہ پتھر کے نوکیلے آلے سے کندہ کاری سے خاکہ بناتے تھے اور پھر اس میں رنگ بھرتے تھے۔ قدیم انسان جانوروں کی تصاویر شاید اس لیے بناتا تھا کہ ان کی روح کو اپنے قبضے میں لے آئے تاکہ وہ اس کا شکار کر سکے۔ یا وہ انسان کے اظہار کی ضرورت کی تکمیل کرتا تھا۔ وہ اپنے اس فن کی وساطت سے گرد و پیش کو خراج تحسین پیش کرتا تھا۔'' علی امام اپنے اسٹوڈنٹس سے مخاطب تھے۔''

آرٹس کونسل کی عمارت کی دوسری منزل کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ کچھ ریڈیو اور ٹی وی کے اداکار لان میں بیٹھے کسی بحث میں مصروف تھے۔

''کیا آج کوئی تقریب ہے کہ بہت سے لوگ آ جا رہے ہیں۔''

''ایسا روزانہ ہوتا ہے۔ جب سے نئے لیکچرر آئے ہیں وہ ویک کلاس لیتے ہیں۔''

''کیا نام ہے جناب کا؟''

''سید علی امام۔ کچھ عرصہ پہلے انگلینڈ سے لوٹے ہیں۔ اسٹوڈنٹس میں بہت مقبول ہو رہے ہیں۔''

''چلو اوپر چلتے ہیں۔ سنیں تو سہی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔''

''دنیا بھر میں تین ہزار سے زائد اسکولز آف پینٹنگ ہیں۔ جن میں افریقی، اسلامی، انڈین، کورین، چینی اور جاپانی مصوری نمایاں ہے۔ چینی مصوری دنیا کی قدیم ترین اور مسلسل فن کارانہ روایت ہے۔ آپ صرف مصوری نہیں کرتے بلکہ ایک مکتب فکر کی تخلیق کرتے ہیں۔ جب اقدار تبدیل ہوتی ہیں تو پچھلے ادارے مر جاتے ہیں۔ آپ صرف اس صورت میں باقی بچتے ہیں جب آپ کا کام مضبوط ہو۔''

سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ کرافٹس کا کلاس روم نوعمر لڑکے لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔

"اسکولز آف پینٹنگ وقتاً فوقتاً ابھرتے اور غائب ہوتے رہتے ہیں۔ مگر فن کار زندہ رہتا ہے۔ ہر سال ہزاروں اسٹوڈنٹس آرٹ اسکولوں سے تربیت لے کر نکلتے ہیں۔ لیکن وہ سب کے سب آرٹسٹ نہیں بنتے۔ آرٹ اسکول ایک اچھا آرٹ ٹیچر تو بنا سکتا ہے لیکن اچھا آرٹسٹ نہیں۔ یہ ادارے آپ کو لکیر کھینچنے، رنگ مکس کرنے اور ان کے استعمال کا طریقہ سکھاتے ہیں۔ آپ کو اچھا مصور بننے کے لیے زیادہ اُن کی اندرونی حس کی ضرورت ہے۔ لکیر کی گرفت کی دسترس ہوتی ہے۔"

امام کو نوعمر لڑکے لڑکیوں کے ساتھ کمیونی کیٹ کرنے میں مزہ آنے لگا تھا۔ آرٹس اینڈ کرافٹس انسٹی ٹیوٹ میں جاب ملنے کے بعد بے ثباتی کے احساسات چھٹنے لگے تھے۔

"سیدا، رے تم نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا۔"

"جی بھائی آج میں گھر پر رہ کر کچھ کام کروں گا۔ میری بہت سی چیزیں بند پڑی ہیں۔ میں نے یورپ کے ملکوں سے بہت ساری اسکیچیں جمع کر رکھی تھیں۔ انہیں کھولوں گا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ صحیح سلامت ہیں یا ٹوٹ گئیں۔" امام نے صحن میں لکڑی کے باکس میں اخبار کے کاغذ میں لپٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے مجسموں اور ظروف کو باہر نکالا۔ باہر کے دروازے پر کچھ شور سا ہوا۔ دو نوجوان لڑکیاں اندر آ گئیں۔ امام انہیں دیکھ کر جھینپا۔ وہ جیکٹ، ٹی شرٹ اور چپل پہنے ہوئے تھا۔ ناہید لپک کر ان کی طرف آئی۔ ان سے اپنے گھر کے نئے فرد کا تعارف کرواتے ہوئے بولی۔

"یہ میرے سید انکل ہیں۔ دس سال بعد لندن سے لوٹے ہیں۔ انکل آرٹسٹ ہیں۔"

"مہمان لڑکیوں میں سے ایک نے "السلام علیکم" کہا۔

"یہ شہناز آپی ہیں اور یہ ان کی چھوٹی بہن گلناز ہے۔ ہم دونوں اسکول میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔"

"معاف کیجیے گا۔ میں اس حلیے میں ہوں۔ دراصل آج میں——"

"کوئی بات نہیں۔"

ناہید نے شہناز کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "آپی کراچی یونیورسٹی میں سوشیالوجی میں ایم اے کر رہی ہیں۔"

"ویری گڈ" امام نے شہناز کو نظر بھر کر دیکھا۔

"سنا ہے کہ آپ دس سال تک انگلینڈ میں رہے۔"

"جی، آپ نے ٹھیک سنا ہے۔"

''تو پھر واپس کیوں آ گئے۔ پاگل ہیں کیا۔ یہاں کوئی آرٹ وارٹ نہیں ہے۔ آپ واپس چلے جائیں۔''

امام مسکرایا۔ ''آپ کہتی ہیں تو واپس چلا جاتا ہوں۔''

شہناز کو احساس ہوا کہ اس نے بنا سوچے سمجھے وہ کچھ کہہ دیا ہے جو بے تکا اور بے موقع تھا۔

آدمی وجود کے عالمی ہیجان کے درمیان رہتا ہے۔ اسے نہ صرف اپنے اطوار اور مشاغل میں جمعیت خاطر کی ضرورت ہے بلکہ وہ اسے اردگرد کی دنیا میں تلاش کرتا ہے۔ زندگی ایک توازن ہے جسے برقرار رکھنے کے لیے وہ کبھی ترمیم کو تسلیم کرتا ہے تو کبھی اسے مسلط کرتا ہے۔

امام کو کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ اپنے شاگردوں کو بتا رہا ہے وہ ان کے ادراک سے بالاتر ہے۔ مشکل ہے۔ اس کی کوشش ہوتی کہ وہ انھیں زیادہ سے زیادہ معلومات دے سکے۔

''سر''ہال میں سے آواز آئی۔ ایک ہاتھ کھڑا ہوا۔

امام کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ آپ کا سامع اگر سوال کر رہا ہے تو جان لیں کہ وہ کچھ نہ کچھ سمجھا ہے۔ جو سمجھ میں نہیں آیا اس کی وضاحت چاہتا ہے۔

''سر میرا سوال یہ ہے کہ آرٹ اور فائن آرٹ میں کیا فرق ہے۔''

''اچھا سوال ہے۔ دیکھیں۔''

''ہر آرٹ میں جبلی اور مادی تجسیم ہوتی ہے۔ وہ تمام پیداوار و تخلیق جس میں جمالیاتی اقدار نمایاں ہوں آرٹ کہلاتی ہیں۔ لیکن فائن آرٹ یا فنِ لطیف میں فن کار اپنے اصل ملبوں کی ان تمام جزیات کی تجرید کرتا ہے جو جمالیاتی اقدار کی نفی کرتی ہیں۔

امام کلاس لینے کے بعد نیچے اترے۔ ناہید کہاں چلی گئی۔ اپنے آپ سے پوچھا۔ ناہید نے انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ صبح گھر سے آرٹس کونسل اور واپسی پر امام کے ہمراہ ہوتی تھی۔ بس اسٹاپ تک پیدل چلتے ہوئے یا رکشہ ٹیکسی کے انتظار میں سڑک کے کنارے کھڑے ہونے کے دوران وہ بات چیت کرتے رہتے۔ سامنے سے ناہید آ رہی تھی۔

''سوری انکل، وہ میری دوست نے باتوں میں لگا لیا تھا۔''

''کوئی بات نہیں، دیر ہو رہی ہے۔ پھر تمہاری ماں کو فکر ہونے لگتی ہے۔'' دونوں رکشے کے انتظار میں کھڑے تھے۔ اس

وقت سواری کی بہت مشکل ہوتی تھی۔ بس میں تو کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہیں ملتی تھی اور رکشہ ٹیکسی والے ذوم سے گزر جاتے تھے۔

"ناہید" امام نے سواری کی کوفت دور کرنے کے لیے بات شروع کی۔

"جی انکل۔"

"وہ تمہاری دوست کی بہن..... کیا نام بتایا تھا اس کا۔"

"جی شہناز آپی۔"

"ہاں وہی، وہ جو اس روز غرارہ شرارہ پہنے ہوئے آئی تھی۔"

"جی وہ لوگ شاید کسی فنکشن میں جا رہے تھے۔"

"وہ کہیں بھی جا رہی تھی لیکن وہ اپنے جوتوں سمیت میرے دل میں اتر گئی ہے۔"

"جی انکل، وہ بہت پیاری ہیں..... میں امی کو بتاؤں گی۔ وہ پہلے ہی مجھے پوچھ رہی تھیں کہ تمہارے چچا کو لڑکی پسند ہو تو میں اس کے ماں باپ سے بات کروں۔"

"وہ تو بعد کی بات ہے۔ میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔"

"کیا بتاؤں ہے مجھے کہہ دیا کہ آپ پاگل ہیں جو انگلینڈ جیسی جگہ چھوڑ کر یہاں آ گئے ہیں۔ آئی ایم انگلینڈ ویٹ۔"

"علی امام صاحب، کیسے ہیں آپ؟" ڈائریکٹر نے علی امام کو خوش آمدید کہا۔ "تشریف رکھیے مجھے آپ کا پیغام مل گیا تھا۔ میں آپ ہی کے انتظار میں رکا رہا۔ حالانکہ مجھے ایک جگہ ضروری کام سے جانا تھا۔"

"آئی ایم سوری سر، لیکچر شروع کرتا ہوں تو پھر مجھے وقت کا احساس ہی نہیں رہتا۔"

"کوئی بات نہیں، میرے لائق کیا خدمت ہے۔"

"کچھ نہیں سر، وہ جو آپ نے سلیبس کا ڈرافٹ پڑھنے کے لیے دیا تھا۔ میں اسی کے بارے میں آپ سے ملنا چاہتا تھا۔"

"فرمایئے۔"

"یہ سلیبس بالکل اوٹ پٹانگ ہے۔ اس پر بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر یہ بورڈ میٹنگ میں نہیں رکھا جا سکتا۔"

"آپ اس کی خامیوں کی نشاندہی کریں۔"

"نہیں صاحب، نصاب کو پھر سے بنانا ہوگا۔ تاکہ جب آرٹ اسٹوڈنٹس یہاں سے نکلیں تو وہ آرٹ ہسٹری، اور دنیا بھر میں آرٹ کی تحریکوں سے واقف ہوں اور ان کا پاکستان کے آرٹ کے تناظر میں تجزیہ کر سکیں۔"

"میں آپ کی بات مانتا ہوں۔ لیکن پہلے ایک خبر سن لیں۔ انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ وہ ابھی میرے پاس ہے۔ اسے بورڈ کی اگلی میٹنگ میں رکھا جائے گا۔ کچھ دوستوں کا مشورہ ہے کہ آپ کو پرنسپل بنا دیا جائے۔"

"نہیں سر، میں یہ ذمہ داری نہ اٹھا سکوں گا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ میں پڑھانا چاہتا ہوں۔ جو کچھ میں نے سیکھا ہے، جانتا ہوں اسے نئی نسل کو منتقل کرنا چاہتا ہوں۔ پھر میں ویسے بھی ایڈمنسٹریشن میں زیرو ہوں۔ اس میں بہت سے جھنجھٹ ہوتے ہیں میں تو سیدھا سادہ آرٹ ٹیچر ہوں۔"

"آپ کو سوچنے کا وقت دیا جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ آفر بہت اچھی ہے۔ ادارے کی سربراہی ایک قابل شخص کو کرنی چاہیے۔ مجھے آپ کے علاوہ کوئی اور اس کا اہل نظر نہیں آ رہا۔"

علی امام نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تو میں اجازت چاہتا ہوں۔ آپ کو دو چار روز میں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گا۔"

امام نے آرٹس کونسل سے گھر جانے کے بجائے سمندر کا رخ کیا۔ اسے ریت میں پڑے گھونگھے اور سیپیاں بہت دلچسپ معلوم ہوتی تھیں۔ ان کی ہیئتیں، بھوری، گرے اور سیاہ شریانوں میں سے جھلکتی ہوئی سفید کھردری سطح، گھونگھوں کی ابھرتی ہوئی گولائیاں اسے مسحور کرتی تھیں۔ وہ ایک ڈھابے سے ٹھنڈا مشروب لے کر ایک پتھر پر آ بیٹھا تھا۔ نم ہوا کے تیز جھونکے اس کے گھنگریالے بالوں کو بار بار بے ترتیب کر دیتے تھے۔ دور سے اٹھتی ہوئیں منہ زور لہروں کا شور ساحل سے ٹکرا کر دھیما پڑ جاتا تھا۔

"بھابی، آج بڑی خوشبو آ رہی ہے۔ کیا پک رہا ہے۔" امام نے باورچی خانے میں جھانک کر دیکھا۔ "بھائی جان کیا کام سے واپس نہیں آئے۔"

"شاید نہانے چلے گئے ہوں گے۔ میں میتھی آلو کی بھجیا بنا رہی تھی۔ تمہیں پسند ہے نا۔"

"ویری گڈ۔ لیکن آج اتنی خاموشی کیوں ہے۔"

بھاوج نے کوئی جواب نہیں دیا۔

کمرے سے ناہید نکلی۔ امام کو دیکھ کر ٹھٹکی۔

"وہ انکل ۔۔۔ وہ۔" ماں کی طرف دیکھا تو بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کیا وہ انکار کر گئی ہے۔ بات کیا ہے۔"

"کچھ نہیں انکل امی سے پوچھ لیں۔"

"کیا پوچھوں؟!"

"کل بتا رہے۔" ماں کی طرف سے اجازت مل گئی۔

"شہناز آپی نے انکار کر دیا ہے۔"

"تو کیا ہوا، پریشان ہونے کی بات نہیں۔"

"تمہیں سید، اچھا تو نہیں ہے۔ انہیں میرے دیور جیسا کون ملے گا۔"

"انکار کی وجہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں انکل۔ وہ کہتی ہیں میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ وہ ایم اے کے بعد پی ایچ ڈی کے لیے لندن جانا چاہتی ہیں۔ کہتی ہیں۔ ویسے بھی یہ آرٹسٹ لوگ بہت مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل کام ہے۔"

"ایک اور قضیہ بھی کھڑا ہو گیا ہے۔ وہ لوگ سنی ہیں۔"

"لیکن میرے لیے شیعہ سنی کا کوئی فرق نہیں۔"

"بھئی، وہ لوگ سنی داماد چاہیں گے۔"

"ان کی مرضی۔ زبردستی تو نہیں ہے۔"

"تو فکر نہ کر۔ تم اصلی سید ہو۔ میں تمہارے لیے شیعہ لڑکیوں کی لائن لگا دوں گی۔"

امام سوچوں میں گم تھا۔

زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی نے انکار کیا تھا۔ امام نے سگریٹ جلائی اور اپنی ہار کو دھوئیں کے مرغولوں میں اڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

علی امام نے پرنسپل کا عہدہ سنبھالنے کے بعد انتظامیہ کے سامنے کچھ مطالبات رکھے تھے۔ سب سے اہم یہ تھا کہ ایک سلائیڈ پروجیکٹر فوری طور پر فراہم کیا جائے۔

"میں نے برٹش کونسل، امریکن لائبریری اور گوئٹے انسٹی ٹیوٹ سے بات کر لی ہے۔ کل فرانسیسی قونصل جنرل سے

ملاقات کا وقت لیا ہے۔ ان سب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ یورپی ماسٹرز کی تصاویر کی ٹرانسپیرنسیاں دیں گے۔ سامنے تصویر ہو تو اس کی وضاحت کرنے اور اسٹوڈنٹس کو سمجھانے میں آسانی رہے گی۔"

"لیکن اس سال کے بجٹ میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔"

"بہت مہنگا پروجیکٹر خریدنے کی ضرورت نہیں لیکن اسے کارآمد ہونا چاہیے۔ ویسے میں کوشش کروں گا کہ کسی قونصل خانے سے حاصل کر لیا جائے۔ امید ہے وہ بخوشی اس کا عطیہ دے دیں گے۔"

"تم نے درست کہا۔ تجریدی آرٹ کو دیکھ کر اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں۔ بلکہ مذاق اڑاتے ہیں کہ یہ کیا بنا ہے۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ یہ محض لاعلمی اور آرٹ کے رموز سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔"

ہال میں موجود اسٹوڈنٹس ایک آرٹسٹ اور اپنے استاد سے ایک موضوع سوال کے وضاحتی جواب کے منتظر تھے۔

حقیقت نگار مصور فن برائے فن کی منطق کو مسترد کرتے ہیں اور وہ فن برائے زندگی کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ حقیقت ہمارے عہد میں نظریہ وجودیت، خیال کے نظام کا نمایاں وصف ہے جو جدید فن کے دو مختلف رجحانات کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ ایک ڈرامائی حقیقت پسندی ہے جس کا موضوع انسان کے مصائب اور اس کی محرومیاں ہیں۔ دوسرا رجحان تجریدیت ہے، جس کے ذریعے جدید آدمی آج کی دنیا کی بے یقینی اور عدم تحفظ سے فرار حاصل کرتے ہوئے اور تکلیف دہ حقائق سے آزاد ہو کر یعنی مقصدیت کے برعکس قطعی طور پر نئی حقیقت کو تخلیق کرتا ہے۔ سائنس کے ارتقا نے بھی فن مصوری پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔ مثال کے طور پر فلکیات، کرسٹل اور مائیکرو اسکوپ کے وسیلے سے لی گئی تصاویر نے آرٹسٹ کے لیے نئی وژول دنیا کھولی ہے۔ جس میں وہ زوال کے بجائے اپنے اندرون سے تخلیقی تحریک پاتا ہے۔ فطرت کے نئے پہلو عجیب اور متنوع ہیں اور وہ عظیم الشان کائناتی زندگی کی توثیق کرتے ہیں۔ مائیکرو اسکوپ اور ٹیلی اسکوپ کے استعمال سے آرٹسٹ فطرت سے بہت اپنائیت کے ساتھ آشنا ہوتا ہے۔ جو اس سے مختلف ہے جس سے اس کے پیش رو واقف تھے۔

"ارے بھئی تم لوگ کہاں ہو۔ شہناز، گلناز۔"

"جی امی، میں تو پڑھ رہی تھی۔ شہناز آپی کمرے میں ہیں۔" گلناز آواز سن کر ماں کی طرف آئی۔

"وہ اس وقت کیا کر رہی ہے۔" ماں نے پوچھا۔

"موڈ خراب ہے۔ صبح سے اپنی چیزوں کو الٹ پلٹ رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں میرا پاسپورٹ نہیں مل رہا۔"

ماں چپ رہی۔ "اچھا بلاؤ اسے۔" شہناز تکیے میں سر چھپائے رو رہی تھی۔ بہن کو کمرے میں آتے دیکھ کر کروٹ لی اور منہ دیوار کی طرف کر لیا۔

"امی بلا رہی ہیں۔" جواب میں خاموشی تھی۔

ماں اپنے آپ سے باتیں کرنے لگیں۔ "دماغ خراب ہے اس لڑکی کا۔ اچھا بھلا رشتہ آیا اور انکار کر دیا۔ ارے بابا۔ مجھے تین اور بیٹیاں بیاہنی ہیں۔ اچھے رشتے روز روز تو آنے سے رہے۔"

شہناز کو ماں کی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن کوئی جذباتی اپیل اس کے ارادے کو تبدیل نہیں کر سکتی تھی۔

"تم لوگ کچھ بھی کر لو۔ میں لندن ضرور جاؤں گی اور ایک روز پی ایچ ڈی کر کے لوٹوں گی۔" اس نے اپنا فیصلہ بہن پر ٹالا۔

"مبارک ہو" ڈائریکٹر نے کلاس روم میں داخل ہو کر علی امام سے کہا۔ امام حیران تھے کہ وہ کس بات کی مبارکباد دے رہے ہیں۔ اسٹوڈنٹس کینوس کو ایزل پر رکھے اپنی شبیہیں سنوارنے میں مشغول تھے۔ امام ایک لڑکی کو تصویر کے نقش کی درستگی کے بارے میں کچھ سمجھا رہے تھے۔ وہ ڈائریکٹر کی بات سن کر لڑکی کو اس کا برش پکڑاتے ہوئے متوجہ ہوئے۔

"کس بات کی مبارکباد دے رہے ہیں۔ کوئی اچھی خبر ہے کیا۔"

"یقیناً، بہت اچھی خبر ہے۔ ابھی ابھی اسلام آباد سے فون آیا تھا۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ میں نے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ان سے کہا کہ کچھ دیر بعد فون کریں۔ اس وقت وہ کلاس لے رہے ہیں۔"

"اوہ اچھا۔"

"خبر تو مجھے بتا دی وہ آپ سے بھی بات کریں گے۔"

امام کی حیرانگی بدستور تھی۔

"حکومت پاکستان نے جشن آزادی کے موقع پر آپ کو پرائیڈ آف پرفارمنس دینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"لیکن ..."

"لیکن کیا۔ میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو میرے دفتر میں چلیں۔ انھوں نے اپنا ٹیلی فون نمبر چھوڑا ہے۔"

"یہ کیسے ہوا۔ مجھے پاکستان آئے ہوئے ابھی دو سال ہوئے ہیں۔ میں نے کوئی تیر نہیں مارا۔ بچوں کو پڑھایا اور چند ایک تصویریں بنائیں۔ میں اس ایوارڈ کو ڈیزرو نہیں کرتا۔"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔ یہ ایوارڈ آپ کا ہے۔ کچھ لوگوں کو مقام اور شہرت حاصل کرنے کے لیے زیادہ وقت نہیں لگتا۔"

امام کے فن کے ارتقائی عمل میں وقت کے ساتھ بتدریج تبدیلیاں آتی رہیں۔ لیکن لندن میں ترک کردہ سرخ چونچ والا طوطا ابھی تک پنجرے کے اندر تھا۔ وہ آزاد ہوا تو امام کے ہاں آرکیٹیکچر اور مصوری کا امتزاج پیدا ہوا جو تجریدیت اور حقیقت پرستی کو پہلو بہ پہلو ہم آہنگ کرتا تھا۔ رنگوں کی شوخی مدھم پڑنے لگی تھی۔ اب وہاں انسانی صورت گری میں متانت تھی اور تجسیم کے گہرے سیاہ بیرونی خط تحلیل ہو گئے تھے۔

"شہناز آپی نے ہاں کر دی۔" امام کو بتایا گیا۔

امام نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

بھابی کی آواز آئی۔ "سید تم نے سنا شہناز تمہارے ساتھ شادی کرنے کے لیے راضی ہو گئی ہے۔"

"جی بھابی جان، میں نے سن لیا" پھر قریب میں کھڑی ہوئی ناہید سے مخاطب ہوئے "اب کیسے مان گئیں۔ کتنی مشکل ہاں ہے۔ دو سال گزر گئے۔ مجھے اپنے کاموں کی مصروفیت میں یہ سب بھول ہی گیا تھا۔ کیا وہ پی ایچ ڈی نہیں کر رہیں۔ کیونکہ میں تو وہی ہوں جسے انہوں نے ٹھکرا دیا تھا۔ کیا یہ میرے پرائڈ آف پرفارمنس کا کمال ہے۔"

ناہید مسکرا رہی تھی۔ "مجھے نہیں معلوم انکل آج نگار آئی تھی اور امی کو پیام دے گئی ہے۔"

"ہوں، لیکن میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ان کے ابا سے ملنا چاہوں گا۔ [illegible]۔"

"جی انکل میں امی کو بتا دیتی ہوں۔"

"تجریدیت فطرت کو مسخ نہیں کرتی بلکہ وہ رنگ و نقش کی لغت ایجاد کرتی ہے، جس سے اس کے مخفی جوہر جھلکتے ہیں۔ مصوری کی تکنیک یا انداز کو بھی جو بنیادی موضوع کو اس سے الگ کرنا مشکل ہے کہ قطعی تجریدی کمپوزیشن میں وژول حقیقت کا حوالہ ضرور ہوتا ہے۔ اس عہد میں مصوری کی فرہنگ عالمی اور بین الاقوامی ہے۔ تجریدی فن مصوری سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اسلوب اور برتاؤ انفرادی ہے لیکن تاثر اور مزاج ایک سا ہے۔ قومیت پرست بیشتر مصوروں پر قومی شناخت کو ملیامیٹ کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ قومی خاصیتوں کو وجود دینا انفرادی ترقی کے لیے نہایت اہم اور سازگار ہے۔

اپنے اسٹوڈنٹس سے امام کا مکالمہ جاری تھا۔

گھر کے دروازے کی گھنٹی بجی تھی۔

کام کرنے والی لڑکی لپک کر باہر گئی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی لوٹی۔

"باجی وہ باہر دروازے پر ایک بابو کھڑا ہے۔ پتلون قمیص میں۔ کہہ رہا تھا ابو سے ملنا ہے۔"

"ارے بابا نام تو پوچھا ہوتا۔ اچھا میں دیکھتی ہوں۔" گلناز دروازے کی طرف گئی۔

"ارے آپ آئیے، ہاں ابو گھر پر ہیں۔"

امام کمرے میں داخل ہوئے تو انوار حسین صاحب نے اخبار دوہرا کر کے میز پر رکھ دیا۔ اپنے آپ میں بڑبڑائے۔ "ملکی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ یحییٰ خان نے وعدہ تو کیا ہے کہ وہ جلد الیکشن کروائے گا۔ لیکن ان فوجیوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ او آئی ایم سوری۔"

"جی میں علی امام ہوں۔"

"ارے ہاں، مجھے گلناز نے بتایا تھا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

امام نے بغل سے فائل نکال کر میز پر رکھے ہوئے اخبار کے اوپر رکھ دی۔

"جی کچھ ضروری باتیں تھیں۔ آپ یوسف بھائی سے واقف ہیں۔ میں ان کا چھوٹا بھائی ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"سر میں ایک پینٹر ہوں۔ آج کل آرٹس کونسل میں پڑھا رہا ہوں۔"

"مجھے یہ بھی معلوم ہے۔"

"سر میری عمر اس وقت 42 سال ہے۔ اور میں دس سال بعد لندن سے لوٹا ہوں۔ اس فائل میں کچھ کاغذات ہیں۔ یہ کہ میں نے لندن میں ایک انگریز لڑکی سے شادی کی تھی۔ طلاق ہو گئی۔ اور ـــــ"

"یہ کہ میری گرل فرینڈز بھی رہی ہیں۔" انوار صاحب نے لقمہ دیا۔

"جی" امام کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

میزبان نے اپنے مہمان کے لیے چائے کے لیے کہا۔

"یہ سب نیچرل ہے۔ میں آپ کی صاف گوئی سے متاثر ہوا ہوں۔"

"جی تو کیا میں مطمئن ہو جاؤں کہ آپ اس رشتے پر راضی ہیں اور میں بھائی بھابی کو کب بھیجوں۔ سر مجھے جہیز وغیرہ کچھ نہیں چاہیے۔ ابھی میں یوسف بھائی کے پاس رہتا ہوں۔ لیکن شادی کے بعد الگ گھر لے لوں گا۔ میری آمدنی زیادہ نہیں ہے۔ لیکن میں آپ کی بیٹی کو خوش رکھوں گا۔"

میزبان واقعی اس سادہ لوحی پر خوش ہو رہے تھے۔

"آپ یوسف اور ان کی بیگم کو میرا سلام دیں۔ ان سے کہیں کہ وہ تاریخ وغیرہ کی بات کر لیں۔ جو بھی تاریخ مناسب ہوگی رکھ لیں گے۔ لیکن ہمیں تھوڑا وقت ضرور چاہیے ہوگا۔ ہمارے گھر کی پہلی شادی ہے۔ کچھ نہ کچھ تیاری کرنی ہوگی۔"

"سر آپ سے ایک بات پوچھنی ہے۔"

"ہاں ضرور۔"

"رئیلزم تو سمجھ میں آتا ہے لیکن سوررئیلزم کیا ہے۔"

"اور زیادہ رئیل اسے سپر رئیلزم بھی کہا جاتا ہے۔"

"جی؟"

"جب شعور اور لاشعور مل کر کام کرتے ہیں تو اظہار کی قوت زیادہ مضبوط زیادہ بامعنی ہو جاتی ہے۔"

سوررئیلزم بیسویں صدی میں ڈاڈا ازم کے ردعمل میں بطور تحریک سامنے آیا۔ جس نے عالمی سطح پر ادب اور فن کو متاثر کیا۔ آندرے بریتوں اس کا بانی تھا۔ وہ فرانس کا ممتاز سوررئیلسٹ شاعر تھا۔ سن 1934 میں برسلز میں ادیبوں اور فن کاروں کے ایک عظیم الشان اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا تھا سوررئیلزم حقیقت کی بنیاد کو گہرائی دینے کی ایک خواہش ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اندر کی حقیقت اور باہر کی حقیقت کے عناصر کی آمیزش کے عمل کو پیش کریں جو بالآخر اکائی بن جاتے ہیں۔

"سید کا دماغ چل گیا ہے۔ ولایت میں رہ کر اپنے ہاں کی روایتوں اور رکھ رکھاؤ کو بھول گیا ہے۔"

یوسف رضا نے بیوی کی غصہ بھری آواز سنی تو پریشان ہو گئے۔ "ارے بھئی کیا ہوا، سید سے کوئی چوک ہو گئی کیا۔ اتنا تاؤ کیوں چڑھا ہوا ہے۔"

"کہہ رہا تھا کہ رخصتی کے وقت وہ اپنی دلہن کو گود میں اٹھا کر لائے گا۔ نعوذ باللہ وہ شریف لوگ ہیں۔ اگر انہوں نے یہ سن لیا تو کہیں وہ رشتے سے انکار نہ کر دیں۔"

یوسف ہنسنے لگے۔ "ایسے ہی شرارت کر رہا ہوگا۔ اچھا تم فکر نہ کرو، میں اسے سمجھا دوں گا۔"

"میں کہے دیتی ہوں۔ اگر وہ ایسی ویسی حرکت کرنے والا ہے تو میں اس کی شادی میں نہیں جاؤں گی۔ آپ جانیں اور آپ کا بھائی۔"

ہمیشہ پہلی بار کے لیے
میں نہیں جانتا کہ تمہیں کبھی دیکھا تھا
تم رات کے کسی لمحے لوٹ آئیں
ایک گھر کی کھڑکی کے کسی زاویے پر
مکمل طور پر جو تصوراتی گھر تھا

آندرے بریتون کا تصوراتی گھر۔ ادب میں سوریلزم کے ابتدائی آثار بودلیئر کی شاعری میں ملتے ہیں۔ سوریلزم کے مینیفسٹو نے فرائیڈ اور ینگ کی تھیوریز پر عمل کیا۔ ینگ کا کہنا تھا کہ تحت الشعور کے امکان کا تجزیہ کرنا مقصود نہیں، بلکہ اسے تسلیم کرنا ہے۔

امام کو معلوم تھا کہ بھابی اس سے خفا ہیں۔ مگر ان سے بات کیے بنا چارہ نہیں تھا۔ وہ باورچی خانے میں بھنڈیاں کتر رہی تھی۔ امام کو قریب آتے دیکھ کر بھی لاتعلقی ظاہر کرتی رہیں۔

"بھابی، آپ سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔"

بھابی نے چھری ترکاری کی ٹوکری میں رکھ دی اور متوجہ ہوگئیں۔ چہرے پر فکرمندی تھی کہ اب یہ کیا نیا گل کھلانے والا ہے۔"

"بھابی، دوحہ کی ایوارڈز کا فنکشن اس بار دوحہ میں گورنر ہاؤس میں منعقد ہو رہا ہے۔ میں اس موقع پر اپنی بیوی کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

"کون سی بیوی۔ ابھی بات پکی ضرور ہوئی ہے۔ ابھی بہت سے معاملات طے کرنے والے ہیں۔"

"آپ لڑکی والوں سے بات کرلیں۔ گورنر ہاؤس سے فون آیا تھا کہ سیٹوں کی ریزرویشن کے لیے آپ کی بیوی کے بارے میں کچھ انفارمیشن چاہیے۔ سیکورٹی سے کلیئر کروانا ہے۔"

"بھئی تم اپنے بھائی سے بات کرو، میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

آندرے بریشن کو ایک بار سوریلزم پر لیکچر دینے کے لیے میکسیکو آنے کی دعوت دی گئی۔ ایئرپورٹ پر آندرے کو کوئی لینے نہیں آیا تھا اور وہ اپنے ہوٹل کی تلاش میں کہیں کھو گیا۔ جھلایا اور اپنے آپ سے کہا۔ "میں بھلا یہاں کیوں آ گیا۔ میکسیکو دنیا کا سب سے بڑا سوریلسٹ شہر ہے۔"

"ہاں بھئی سیمو مبارک ہو۔ میں آج انور صاحب کے پاس گیا تھا۔ وہ مان گئے ہیں۔ یار بڑے عمدہ آدمی ہیں۔ کہنے لگے۔ دو چار روز میں نکاح ہو جائے گا۔ پھر وہ شہناز کو اپنے ہمراہ ایوارڈز کی تقریب میں لے جا سکتے ہیں۔ واپسی میں گھر پر چھوڑ دیں گے۔ رخصتی بعد میں ہوگی۔"

امام کا جی چاہا کہ بھائی سے لپٹ جائے۔ سامنے سے بھابی کو آتے دیکھا تو خود کو روکا۔ وہ جانتا تھا کہ انہیں یہ بات پسند نہیں آئے گی۔ سرگوشی میں کہا "تھینک یو بھائی جان، تھینک یو ویری مچ۔"

ایک سچا خیال حقیقت کی تنگ حدود سے باہر نکل جاتا ہے۔ سوریلزم نام ہی نفسیاتی خودکاری ہے۔ خیال کی ڈکٹیشن جس میں عقل کا کنٹرول نہیں ہے۔ وہ مروجہ جمالیاتی اور اخلاقی اقدار سے کلی طور پر آزاد ہے۔ ایک طرح سے خیال اپنی آزادی کے حق کا تقاضا کرتا ہے۔

علی امام اور شہناز کی شادی کی تقریب میں دونوں خاندانوں کے عزیزوں، رشتے داروں، دوستوں کے علاوہ معززین شہر شریک تھے۔ لڑکیوں کی چہل پہل اور ان کے رنگین پہناوے، عورتوں کی جھلملاتی ساڑھیاں اور دمکتے ہوئے زیور، ہری، سفید، نارنجی، عنابی مشروبات کی ٹرے اٹھائے بیرے۔ مبارکباد کے اڑتے ہوئے جملے، دلہا کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ یکدم قریب کھڑے ہوئے دوست کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ رکا۔ دلہا نے گھڑی دیکھی۔ "اوہ، نو بج گئے۔ میں نے کہا تھا کہ میں آٹھ بجے آؤں گا۔ آپ ساڑھے آٹھ بجے دلہن کو رخصت کر دیں۔ دیر ہو رہی ہے۔"

"کوئی بات نہیں یار، شادیوں میں ایسے ہی ہوتا ہے۔"

"ہوتا ہوگا۔ لیکن میں ــــ میرا پیغام پہنچا دو۔ میں جا رہا ہوں، گیارہ بجے آؤں گا۔"

"کیا کرتے ہو، بری بات ہے۔"

"ہوگی۔ میں اور نہیں رک سکتا۔"

ڈالی اپنے دو تین دوستوں کو لے کر چلا گیا۔ کچھ نظریں اٹھیں۔ چہروں پر حیرانگی چھانے لگی۔ کچھ مہمان آ رہے تھے۔ کچھ رخصت ہو رہے تھے۔ کیا تھا؟ یہ آرٹسٹ لوگ بہت مشکل ہوتے ہیں۔ پاگل ہوتے ہیں۔ کیسا مذاق ہے۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔

گھڑی کی چھوٹی سوئی نے گیارہ اور بڑی سوئی نے بارہ کے ہندسے کو چھوا۔ ڈالی پنڈال میں داخل ہوا۔ چہرہ کھلا ہوا تھا۔

"تم ایسے ہی فکر کر رہے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ گیارہ بجے آؤں گا۔ آپ تیاریاں مکمل کر لیں۔ لو میں آ گیا۔ اپنی دلہن کو لے جائیے۔"

***

حقیقت ایک نسبت ہے۔ حقیقت کے علاوہ ایسے دیگر متعلقہ حوالے بھی ہیں۔ ذہن، ذہن کے ادراک کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ بھی اپنے تئیں اہمیت کے حامل ہیں، جیسے امکان، فریب نظر، الوکھاپن اور خواب۔ جب یہ مختلف ابعاد ایک دوسرے میں ضم ہو کر واحد نظم و ضبط میں ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو یہی سوریلزم ہے۔ پکاسو کیوبزم میں اور یورلیز اخلاقیات میں سوریلسٹ ہو جاتا ہے مگر ہمیشہ نہیں۔

ڈالی مکمل طور پر ایک سوریلسٹ مصور تھا۔ سالوڈور ڈالی کے ہاں پاکٹ واچ بار بار نظر آتی ہے۔ زندگی کے مختلف ادوار کا استعارہ۔ اس کی مشہور پینٹنگ یادوں کی تکرار میں پاکٹ واچ کئی انداز میں ملتی ہے۔ نارنجی رنگ کی سنہری فریم والی گھڑی پر چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔ وقت رک گیا ہے۔ ڈھیر پر رکھی ہوئی گھڑی، درخت کی ٹنڈ منڈ ٹہنیاں، پتے زرد ہو گئے ہیں۔ مچھلی کو سمندری لہروں نے ساحل پر پھینک دیا ہے اور وہ تارہ دوانے کی جدوجہد کی ناکامی کے بعد دم توڑ رہی ہے۔ ڈالی کہتا تھا کہ یہ تصاویر ہاتھ سے پینٹ کی ہوئیں خوابوں کی فوٹوگرافس ہیں، بظاہر حقیقی ہیں، دراصل تجریدی استعارے ہیں۔ مچھلی زندگی، مالدہ، موت، سلاب اور تخلیق کے استعارے ہیں۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کے سانحے کے بعد ڈالی کی تصویروں میں انسانی پیکر دراصل زندگی کا منبع ہے۔ اسی طرح ہیگرا ماچو کی مثالیں ہیں۔

موت کی دہشت، مستقبل کا غالب پردہ، حقوق حراجی کا آئینہ، غیب کا خاموش تاثر، نیند میں خوبصورت دیکل کی چاپ، بابل کے مینار، ناقابل تدارک نفرتیں دیوار پر دماغ کے چھینٹے، یہ سب انسانی جبلت کے تکلیف دہ پرتو ہیں، اور یہ اس یقین کی طرف لے جاتے ہیں کہ ذہن میں ایک ایسا نقطہ موجود ہے جب زندگی اور موت، حقیقی اور تصوراتی، ماضی اور مستقبل، قابل ابلاغ اور ناقابل ابلاغ، بلند اور پست کو متضاد خیال نہیں کیا جاتا۔

علی امام کی دو پینٹنگز، جن کا جوڑا ایک خیال کی طرح ابھرتا ہے۔ لیکن معانی اور مطمع نظر واضح ہے۔ طاقتور سبز دھاری دار گھوڑا اور نازک اندام عورت حرکت اور مزاحمت کی علامتیں، جبکہ دوسری تصویر میں گھوڑے کی قوت اور تیز رفتاری پر اس سے بڑی قوت غالب آجاتی ہے۔ گھوڑا اکھڑتا ہے، طاقت کے اکھاڑے میں وہ ہاتھی کے بھاری بھرکم اور بظاہر بدنما وجود کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے اس کی بالادستی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ وہ اس کی گرفت میں ہے اور بے اختیاری اور بے بسی کے احساس کی لپیٹ میں آگیا ہے۔

اس روز کچھ بھی غیر معمولی نہیں تھا۔ اپنے اپنے کاموں میں مشغول اسٹوڈنٹس۔ اس نے اپنا ایزل آرٹس کونسل کے لان میں سیٹ کر رکھا تھا۔ ہاتھ میں پیلیٹ لیے وہ کبھی ناریل کے اونچے درختوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا، برش سے رنگوں کی آمیزش بناتا پھر کینوس پر سٹروک لگاتا۔ ہنسی کی آواز آئی۔ چند لڑکیوں کا ایک گروپ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ ان میں سے ایک نے نظر اٹھا کر گیٹ کی طرف دیکھا۔ پرنسپل علی امام داخل ہو رہے تھے۔

"آج سر دیر سے آئے ہیں۔"

"ہاں نئی نئی شادی ہوئی ہے نا۔" سب نے اس کی تائید کی۔

امام دوسری منزل تک جانے والی ڈھلوان پر قدم جماتے ہوئے اوپر آئے۔ دفتر کا چپراسی دروازے کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے سلام کیا اور ان کا بیگ پکڑ لیا۔ امام اپنی کرسی پر بیٹھے، گھڑی پر نظر ڈالی۔ میز پر ایک لفافہ رکھا تھا۔ جس پر ان کا نام لکھا تھا۔ کھولا۔

"اوہ" ایک حیرانگی۔ جو قطعی غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ خط آرٹس کونسل کی طرف سے تھا۔ کچھ وضاحتیں طلب کی تھیں۔ کچھ وارننگ دی تھی۔ علی امام پر الزامات تھے کہ ——

وہ بہت مغرب زدہ ہیں۔ نئی نسل کو گمراہ کر رہے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ آزاد خیال ہیں۔ مشرقی اقدار سے ناواقف ہیں۔ ہماری ثقافتی روایات برباد کر رہے ہیں۔

اگر آپ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہیں تو بورڈ کی میٹنگ طلب کی جا سکتی ہے۔

امام نے سگریٹ جلایا۔ میز پر رکھی دھات کی گھنٹی پر ہاتھ مارا۔ اٹینڈنٹ کو چائے کے لیے کہا۔ اور کچھ لکھنے بیٹھ گئے۔

"علی امام نے سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ کرافٹس کی پرنسپل شپ سے استعفیٰ دے دیا ہے۔" اخبار میں خبر لگی تھی۔

کراچی سے نکلنے والے ماہنامے ہیرالڈ نے پچھلے صفحات پر ایک گروپ فوٹو شائع کیا تھا۔ وہ جو علی امام کی الوداعی تقریب کا عکس تھا۔

نقش گراں

شام کے چار بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تھے۔ عینی نے نذیر محمد کو آواز دی۔ وہ اس انتظار میں کہ سب لوگ جائیں اور وہ دفتر بند کرے، بیوی کی کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ عینی نے اسے اسائنمنٹ رجسٹر لانے کو کہا۔ اس نے رجسٹر میں فوٹوگرافر کے لیے ہدایات چھوڑیں۔

صبح ساڑھے دس بجے ماڈرن گیلری نرسری۔ احمد پرویز کا انٹرویو۔ پیچھے بریکٹ میں درج تھا۔ (وقت پر پہنچ جائیں)

گیلری کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ لان اور چار دیواری کے ساتھ پودوں کی قطار پر اچٹتی نظر ڈالتی ہوئی برآمدے کو جانے والی سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر آئی۔ اس کے قدموں کی آواز سن کر کوئی باہر نکلا۔ وہ گیلری کے مالک علی امام تھے۔

"جی میں عینی ہوں رحمان علی۔"

"او ہیلو۔ کیا ہم پہلے مل چکے ہیں؟"

"جی باقاعدہ تعارف تو نہیں ہے۔ لیکن میں نے آپ کو آرٹس کونسل میں دو ایک بار دیکھا ہے۔ میں گیلری کے افتتاح پر بھی آئی تھی۔ لیکن آپ بہت مصروف تھے۔"

"اوہ آئی ایم سوری۔ آپ——؟"

"جی میں جرنلسٹ ہوں۔ مجھے احمد پرویز نے یہاں ملنے کے لیے وقت دیا تھا۔ وہ آ گئے ہیں کیا؟"

علی امام نے دروازہ کھول کر کمرے کے وسط میں رکھے فوم کی گدیوں والے لکڑی کے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ کبھی وقت کا پابند نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں انتظار کر لیتی ہوں۔"

"آپ چائے پئیں گی؟"

"نہیں پلیز۔ تھینک یو۔"

عینی نے بیگ میں سے تہہ در تہہ کی ہوئی سلپس نکالیں۔ یہ اس کی عادت تھی وہ رپورٹنگ یا انٹرویو کے لیے

نوٹ بک یا رائٹنگ پیڈ کے بجائے کاغذ کے کھلے ورقوں پر ہی نوٹس لیتی تھی۔ کمرے میں ایک خاتون ٹرے میں چائے کی پیالی رکھے داخل ہوئیں۔ مینی نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ جاذب نظر سلونی رنگت پر ہلکے زرد رنگ کی سوتی ساڑھی بج رہی تھی۔

"السلام علیکم۔ آپ کے لیے چائے۔ میں شہناز امام ہوں۔"

"شکریہ۔ میں مینی ہوں۔ احمد پرویز کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"ہاں امام صاحب نے بتایا ہے۔"

"وہ ابھی تک نہیں آئے۔ مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہوگا۔" امام نے جو کچھ دیر قبل گیلری کے اندرونی حصے کی طرف چلے گئے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"شنالو، دیکھنا گاڑی کی چابی کہاں ہے۔ میں اسے لے کر ابھی آتا ہوں۔"

وہ طارق روڈ کی کسی بار میں بیٹھا ہوگا۔ امام نے دل میں سوچا۔

انھوں نے گیراج میں کھڑی اپنی پرانی آسٹن کو اسٹارٹ کرنا چاہا۔ وہ نخرے کر رہی تھی۔ وہ تین بار سیلف مارا تو مان گئی۔

اس دوران مینی نے ہال میں لگی ہوئی تصویروں کو دیکھنے کا ارادہ کیا تو شہناز نے اسپاٹ لائٹس جلا دیں۔

"کیا آپ کی رہائش یہیں ہے۔"

شہناز پھیکا سا ہنسی۔ "جی مکان کے اندرونی حصے میں ہماری رہائش ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ ٹرانسپورٹ کا پرابلم نہیں ہوتا۔"

سہولت تو ہے۔ اس سے نجی زندگی میں خلل بھی پڑتا ہے۔ لیکن مجبوری ہے۔ رہائش اور گیلری کو الگ کرنا ممکن نہیں تھا۔ اخراجات بہت بڑھ جاتے۔ ویسے بھی گیلری چلانا فل ٹائم کام ہے۔"

گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ "میرا خیال ہے امام صاحب احمد پرویز کو پکڑ لائے ہیں۔"

شہناز کا قیاس درست تھا۔ احمد پرویز کچھ شرمندہ سے معذرت کرتے ہوئے داخل ہوئے۔

"آئی ایم ریئلی سوری۔ میں بھول گیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" مینی نے گھڑی دیکھی۔ "کچھ دیر پہلے فوٹوگرافر یہ کہتے ہوئے چلا گیا تھا کہ بس میں اور انتظار نہیں کر سکتا۔ مجھے ڈیلی کے کام سے جانا ہے۔"

دوپہر کا ایک بج گیا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ کہیں اور چل کر بیٹھتے ہیں۔ کھانا بھی کھالیں گے اور باتیں بھی ہو جائیں گی۔" پرویز کو یہ تجویز پسند

آئی تھی۔

"طارق روڈ چلتے ہیں۔ چائنیز کیسا رہے گا۔" علی نے پوچھا۔

ونڈرفل، مجھے چائنیز فوڈ پسند ہے۔"

لنچ کے وقت گنگ تن ریسٹوران میں حسب معمول بہت رش تھا۔ بمشکل ایک کونے کا میز مل پایا۔ کھانے کا آرڈر دیا۔ اس خیال سے کہ کھانا آنے میں کم از کم آدھا گھنٹہ لگے گا۔ علی نے گفتگو شروع کی۔

"تجریدی آرٹ پر عام شخص کہتا ہے کہ یہ کیا بنا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"جب چڑیاں چہچہاتی ہیں تو بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن ان کی چہک کی نغمگی دل کو چھوتی ہے۔"

"جی ہاں، یہی بات پکاسو نے کچھ مختلف انداز میں کہی تھی۔"

"ایک مصور علامتوں اور استعاروں سے اپنی دنیا تعمیر کرتا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے شاعر الفاظ سے۔"

احمد پرویز ایک ایکسپریشنسٹ پینٹر کے طور پر پہچانا جاتا تھا۔

ایکسپریشنزم سے مراد جذباتی تاثر کی مبالغہ آمیزی اور شکستگی سے تصویر کشی کرتا ہے۔ خصوصاً برش کے مشتعل اسٹروکس اور گہرے رنگوں کے وسیلے سے۔ آرٹسٹ با مقصد حقیقت نگاری کے بجائے اپنے ان معروضی جذبات کا اظہار کرتا ہے، جو اشیا اور واقعات نے متحرک کیے تھے۔ اس ذاتی اظہار میں بے ساختگی ہوتی ہے۔ وہ اپنے اردگرد کی دنیا کے عناصر کی شکل نہیں بناتا بلکہ دنیا سے متعلق اپنی حسیات کو پرزور طریقے سے مسلط کرتا ہے۔

بیرے نے سوپ کا پیالہ رکھا تو اس میں سے اشتہا انگیز خوشبو کے لپٹے اٹھ رہے تھے۔

"جی آپ لیں۔" علی نے میزبانی کا کردار ادا کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، پہلے آپ۔" پرویز مردانہ شیطاری دکھا رہے تھے۔

"عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ ماڈرن آرٹ باہر سے آیا ہے۔"

علی نے سوپ میں چلی ساس ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں جب سے واپس آیا ہوں ایسے ہی بیانات سن رہا ہوں کہ یہ مغرب زدہ ہے۔ اس کا فن پاکستانی نہیں ہے۔ میں دس سال لندن میں رہا۔ وہاں سے بہت کچھ سیکھا، بہت کچھ دیکھا، جانا لیکن میری تصویر اپنے گرد و پیش سے نکلی ہے۔"

پرویز اس پر یقین رکھتے تھے کہ ہر پینٹر اپنی امیجری بناتا ہے اور ان علامتوں کو تصویر کے تقاضوں کے مطابق کینوس پر سیٹ کرتا ہے تاکہ وہ جمالیاتی تاثر بھرپور طور پر ابھار سکے۔ یہ اس کا ہنر ہے جو گیوں کی دھول اور پتھروں کو سونا بنا دیتا ہے۔

''لندن کا آسمان زیادہ تر ابر آلود اور دھندلا ہوتا تھا۔ یہاں کے سورج کی روشنی نے میری تصویروں کو جگمگا دیا ہے۔ دریا شعلہ بار ہو کر گرد و پیش کے پھولوں پر تصیر جاتا ہے۔''

''کچھ عرصہ قبل آپ اور صادقین کے مابین تنازعہ کھڑا ہو گیا تھا؟''

''ہاں یار، میری چھوٹی سی بات پر بہت واویلا مچا۔''

''بحث مباحثہ اچھی بات ہے۔ اس سے ادب اور فن میں بہتری آتی ہے۔''

''ہوا یہ کہ ــــــ''

صادقین کی کمزری کا حوالہ میری پر احمد پرویز کا کہنا تھا کہ ہماری سرزمین پر کمزری کے جالے نہیں ہیں۔ ہمیں منفی سوچ نہیں رکھنی چاہیے۔ ہم بلاشبہ دکھوں کے بیچے ہیں لیکن ہمارے گرد کمزری کے جالے نہیں لپٹے ہوئے۔ اس پر یہ رائے آئی کہ صادقین قنوطی نہیں ہیں بلکہ حقیقت پسند ہیں۔ صادقین کے نزدیک کمزری کے یہ جالے ان لوگوں نے بنائے ہیں جو سیاسی سازشوں مذہبی انتہا پسندی اور مصنوعی اقتدار کو فروغ دیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں معاشرے میں غیر صحت مند جمود پیدا ہوا اور ہر شخص کمزری کے جالے کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔

بیرے نے بل میز پر رکھا۔ احمد پرویز نے ادائیگی کی پیشکش کی۔ ''نہیں جی کی یہ دعوت میں نے آپ کو دی تھی۔'' عینی نے بل اٹھایا۔

''میرا دفتر بلیو ایریا کی ای ایچ اوپی اس بلاک کے میں ہے آپ کو کہاں جانا ہے۔ میں ڈراپ کر دوں گی۔'' عینی نے ریسٹورنٹ سے باہر آ کر احمد پرویز کو پیشکش کی۔ ''نہیں میں خود ہی چلا جاؤں گا۔ تھینک یو۔''

عینی نے گاڑی بیک کی۔ سائیڈ مرر میں جھانکا۔ احمد پرویز طارق روڈ کی طرف جاتے جاتے سگریٹ پان کے کھوکھے کے سامنے رک گئے تھے۔

''جی سر باہر ایک صاحب آئے ہیں۔'' فریم فیاض گیلری کے برآمدے میں کچھ تصویروں کے فریم اتار رہا تھا۔ نو وارد کو دیکھ کر اٹھا۔

''کون ہیں۔'' علی امام نے پوچھا۔

''جی انہوں نے نام نہیں بتایا۔ بولا کہ آپ سے ملنا ہے۔''

''اچھا انہیں اندر لے آؤ۔''

وہ شخص سفید شرٹ اور گہرے براؤن رنگ کی پتلون میں ملبوس کمرے میں داخل ہوا۔

''جی میرا نام وہاب جعفر ہے۔''

علی امام اس وقت پینٹنگ کی کلاس لے رہے تھے۔ ان کی شاگردوں میں ۸ لڑکیاں اسکیچنگ کر رہی تھیں۔ علی امام انہیں کچھ ہدایات دے کر اپنے اسٹوڈیو سے پیچھے بڑے کمرے میں آ گئے تھے۔

''تشریف رکھیں۔'' میرے لیے کیا ـــــ یانی وی ہے آپ کا تعارف؟''

''جی میں ایک انڈسٹرلسٹ ہوں۔''

او کے۔ فائن۔''

''جی میں نے اپنا نیا گھر بنایا ہے، بہادر آباد میں۔ میں اس کے لیے کچھ تصویریں خریدنا چاہتا تھا۔ بوہری بازار میں ایک دو دکانوں پر تصویریں ملتی ہیں۔ لیکن وہ مجھے پسند نہیں آ ئیں۔ مجھے کسی نے آپ کے پاس آنے کا مشورہ دیا تو میں چلا آیا۔''

علی امام بغور اپنے مہمان کی بات سن رہے تھے۔ گیلری کی دیواروں پر جو تصویریں لگی تھیں وہ سب کی سب تجریدی اور نیم تجریدی تھیں۔ علی امام بھانپ گئے کہ اس شخص کو یہ سب پسند نہیں آ رہا۔ وہ کنفیوز نظر آ رہا تھا۔

''آپ کے پاس ٹائم ہو تو میں آپ کو دو ایک مصوروں کے ہاں لے چلتا ہوں۔ وہ حقیقت نگاری کرتے ہیں۔ امید ہے آپ کو ان کی تصویریں پسند آ ئیں گی۔''

''جی، جیسے آپ کہیں۔ ویسے آپ کو۔ یعنی آپ کی اسٹوڈنٹس ـــ شاید آپ مصروف تھے۔''

''اچھا ٹھیک ہے، شام کا کوئی وقت رکھ لیتے ہیں۔''

آرٹس کونسل میں صادقین کی خطاطی کی نمائش لگی تھی۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ عقیدت مند جوق در جوق آ رہے تھے۔ صادقین ہمیشہ سے من موجی تھے۔ ذاتی طور پر بھی اور فنی طور پر بھی۔ وہ اپنے اندر کے اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے حرف کے خط کو بھرپور طاقت سے کھینچتے ہوئے کبھی اسے روایتی وضع کے برعکس تیدہ وبناتے اور کبھی اختصار پر اکتفا کرتے۔ لیکن مجموعی تاثر یہ گواہی دیتا کہ جذباتی گداز نے کرشل سے اٹھنے والی شعاعوں کو قابو کیا ہے۔ ان کی خطاطی پر رجعت پسندوں کی آوازیں اٹھیں کہ صادقین نے قرآنی آیات کی بے حرمتی کی ہے۔ جبکہ سمجھنے والے کہتے کہ صادقین نے حروف کی سنگت مرتب کی ہے۔

ان کے سروں میں رنگ و نقش کی مرکیاں جڑی ہیں۔

علی امام رات گئے تک پڑھتے رہے تھے۔ قریب سے شہناز کے چھوٹے چھوٹے خراٹوں کا جلترنگ بکھر رہا تھا۔ کچھ دیر میں وہ دو تین بجا کر سو گئے کہ نیاؤں نیاؤں، اُنوں اُنوں کی آواز سے چونک کر جاگ گئے۔ احسن رو رہا تھا۔ وہ مشکل سے سوا دو سال چھوٹا تھا۔ امام اٹھے۔ احسن پی کرنے کے بعد ٹانگیں چلا رہا تھا۔ اس کا نیپی تبدیل کیا۔ اب وہ انگوٹھا چوسنے لگا تھا۔ مگر تھوڑی دیر بعد ایک چیاں کی آواز آئی۔ امام کو خیال آیا کہ اسے بھوک لگی ہے۔ انہوں نے رات کو ہی تھرموس میں گرم پانی محفوظ کر لیا تھا کہ بدمعاش کو صبح سویرے دودھ چاہیے ہوگا۔ فیڈر اس کے منہ کو لگا کر گھڑی دیکھی تو صبح کے سوا تین بجے تھے۔ شہناز نے اس تمام کارروائی سے بے خبری میں کروٹ بدلی اور وہ بدستور محو خواب تھی۔ احسن دودھ پی کر مست ہو گیا تو امام کی آنکھ بھی لگ گئی۔

"سنیں" شہناز نے امام کا کندھا تھپتھپایا۔

"ہوں۔"

"نو بج رہے ہیں۔ اٹھیں ناشتہ کر لیں۔ آپ کو یاد ہے کہ عینی نے ساڑھے دس بجے آنے کے لیے کہا تھا۔"

"ارے ہاں، ہائے بھول ہی گیا۔ یہ عینی بھی خوب عورت ہے وقت مقرر کرے تو عین اس وقت پہنچ جاتی ہے کہ آپ گھڑی کی سوئیاں ملا لیں۔" امام اپنے آپ میں بڑبڑائے۔

ہال میں علی امام کی "ماں اور بچہ" کی سیریز کی تصویریں آویزاں تھیں۔ عینی دیر تک ماں کی گود میں بچے کی راحت، تحفظ اور ماں کے چہرے پر امڈتی ہوئی شفقت کے تاثرات کو بغور دیکھتی رہی۔ علی امام اسٹوڈیو میں تھے۔ ایزل پر ایک ادھوری تصویر لگی تھی۔ ایک نسائی پیکر کے خدوخال لیلے زرد، نارنجی اور سرخ رنگوں کی آمیزش سے بظاہر مکمل نظر آ رہے تھے۔ لیکن تصویر مکمل نہیں ہوئی تھی۔ آرٹسٹ نے گہرے رنگوں پر پیلیٹ نائف سے سفید رنگ کے چھوٹے چھوٹے اسٹروکس لگائے تھے۔ جن کے اندر سے فکر و ہنر کا پرتو منعکس تھا اور مجموعی تاثر میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی تھی۔

"او ہیلو عینی کیسی ہو۔" امام متوجہ ہوئے۔

"شکریہ۔ میں ٹھیک ہوں۔ آپ اپنا کام جاری رکھیں۔"

"نہیں، کوئی جلدی نہیں۔ شالو، دو کپ چائے بھجوا دو۔" امام نے آواز دی۔

"ماں اور بچہ" کا سیریز بنانے کا خیال کیا میڈونا پینٹنگ کی یورپی تصویروں کا تسلسل ہے۔"

''ممکن ہے، لیکن اس میں میرا ذاتی تجربہ بھی شامل ہے۔ دنیا کی ہر عورت بچے کے بارے میں بہت جذباتی ہوتی ہے۔ ظلّی اور احسن کی پیدائش کے بعد ان کے بارے میں شہناز کی وارفتگی بہت اثر انگیز تھی۔ سچ بتاؤں اگر اچھی عورت کا ساتھ مل جائے تو زندگی مکمل ہو جاتی ہے۔ بچے ہو جائیں تو زندگی کے معانی سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔''

''آپ کی موجودہ تصویریں پہلی تصویروں سے مختلف ہیں۔ کیا یہ شعوری کوشش ہے یا ایسا از خود ہوتا رہا۔''

''وقت کے ساتھ اسلوب میں تبدیلی از خود آتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو تجربے کے طور پر ایسا کرنا ضروری ہے۔''

''لیکن ایک اسلوب کو قائم رکھتے ہوئے بھی تنوع پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح آرٹسٹ کی تخلیق اس کی پہچان بن جاتی ہے۔''

''آرٹسٹ کچھ بھی ہو جائے، کوئی بھی انداز اختیار کرے اس کی چھاپ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی انداز میں نظر آ جاتی ہے۔ پکاسو نے بہت سے انداز اپنائے۔ میڈیم تبدیل کرتا رہا، مجسمہ سازی کی، ظروف سازی کی، گرافکس کی طرف آیا۔ لیکن پکاسو ہر وقت موجود رہا۔ میں پکاسو نہیں ہوں۔ لیکن خود کو دہرانا دراصل خودکشی کرتا ہے۔''

''پاکستان میں مصوری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''ہمارے ہاں بہت سے اہم مصور ہیں۔ سر دست میں جدید پینٹرز کے بارے میں بات کروں گا۔ کئی نام ہیں۔ شاکر علی، احمد پرویز، شمزا عصر حاضر کے ممتاز پینٹر ہیں۔ لیکن ان کا فن اوریجنل نہیں ہے۔ ماخوذ ہے۔ پکاسو، وان گاف، پال کلے اوریجنل تھے۔ یہ جدید فن کے باپ تھے۔ ہمارے مصوروں کا موضوع اور جزئیات ان کی اپنی ہیں۔ ان میں سے بعض نے ایرانی فن مصوری کے عناصر کو اپنایا لیکن تنوع پیدا کرنے میں زیادہ کامیاب نہ رہے۔ صادقین کا فن پال کلے کے فن سے ماخوذ ہے۔ پال کلے کے ہاں بہت تنوع تھا۔ وہ ایک کپ، ایک پتے سے کئی اشکال نکال لیتا تھا۔ دستور فن سے منفرد اشکال وضع کرنا تخلیقی فن کی گواہی دیتا ہے۔ ہمارے ہاں کے مصوروں کا بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ فن کی دیگر جہتوں میں ملوث نہیں ہوتے۔ مثلاً ادب، موسیقی، تھیٹر اس کے بغیر خیال میں زرخیزی نہیں آتی۔ مصوری محض لکیریں اور رنگ لگانے کا نام نہیں ہے۔ اس کے لیے وژن کی ضرورت ہے۔ شیکسپیئر نے کہا ''ہونا اور کچھ نہیں'' سارتر نے کہا ''ہونا اور نہ ہونا'' ان چھوٹے جملوں میں زبردست خیال ہے جسے بیان کرنے کے لیے ہزاروں الفاظ کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ہمارے ادب کا حال ہے۔ اقبال اور فیض کے بعد آنے والے شاعر اور ادیب متوسط درجے کے ہیں۔ وہ اوج کمال تک نہیں پہنچ سکتے۔ اقبال اور فیض وژنری تھے۔ اسی کی بدولت وہ اس مقام پر پہنچے۔''

''آپ ایک آرٹسٹ ہیں۔ گیلری کھولنے کا خیال کیوں آیا۔''

"میں آرٹ کلچر کلٹیویٹ کرنا چاہتا ہوں۔ لندن میں قیام کے دوران میں نے پارٹ ٹائم ملازمت ضرور کی لیکن زیادہ تر انحصار تصویروں کی فروخت پر تھا۔ میں مسلسل پینٹ کرتا رہا اور تصویریں بکتی رہیں۔ میں پبلک ریلیشنز میں بہت اچھا ہوں۔"

شہباز کی آواز آئی۔ "سنیں، بھئی سے کہیے کہ کھانا کھا کر جائے۔ ایک بج رہا ہے۔"

عینی نے معذرت چاہی کہ اسے کام ختم کر کے دفتر پہنچنا ہے۔ کاپی پریس جائے گی۔ بہت کام پڑا ہوگا۔"

شہباز نے گفتگو کا سلسلہ توڑ دیا تھا۔ لیکن امام نے بات وہیں سے شروع کی۔

"میں تصویر سے بہت کما سکتا تھا۔ گیلری کا انتظام بہت مشکل کام ہے۔ لیکن میں اس کے وسیلے سے آرٹ کو گھروں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ آرٹسٹ بکے گا تو اس کے فن کو فروغ ملے گا۔ پچھلے چند برسوں میں صورت حال بہتر ہوئی ہے۔ اب آرٹسٹ خوش حال ہو گئے ہیں۔ بدقسمتی سے ان کے فن کی کوالٹی بہتر نہیں ہوئی۔ تصویر بیچنے کی خاطر کوکیز بنانے لگے ہیں۔ جمعو جوائس بکتا نہیں تھا۔ وہ غریب تھا لیکن وہ ایک جینئس تھا۔ اس کا وژن بہت وسیع تھا۔"

عینی دفتر سے اٹھنے لگی تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس کی جرنلسٹ دوست عمرانہ لائن پر تھی۔

"ہاں سنو، کیا پروگرام ہے۔"

"کام ہے کا! فی الحال تو میں گھر جا رہی ہوں۔"

"یار، میری ایک دوست ہے ناہید رضا اس کی تصویروں کی پہلی نمائش ہے۔ اسے کور تو کر دو۔ اچھی آرٹسٹ ہے۔"

"کب؟"

"کل شام گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں ہے۔ ضرور آنا۔ اچھا تو ملاقات ہوگی۔"

"او کے، آ جاؤں گی۔"

ایک دبلی پتلی، سانولی سی لڑکی، شانوں تک تراشے ہوئے بال۔ وہ کامدار ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ یہ ناہید کی زندگی کا ایک اہم دن تھا۔ اس کے فن پارے پہلی بار منظر عام پر آئے تھے۔ جرمنی کے ثقافتی ادارے میں خاصی رونق تھی۔ فوٹوگرافروں کی فلیش گنز بار بار جھپک رہی تھیں۔ ناہید نے اپنی کمپوزیشنز میں گیرا نیلا رنگ بکثرت استعمال کیا تھا۔ جس کی یکسانیت کو سرخ، نارنجی اور زرد رنگوں کے ٹکڑوں سے توڑا گیا تھا۔ ان تصاویر کی نمایاں خصوصیت تھی کہ کینوس کی سطح ہموار تھی۔ ٹیکسچر لس کی ترغیب دے رہا تھا۔ رنگوں کے استعمال میں خود اعتمادی تھی لیکن سمت کا تعین اور معانی غیر یقینی تھے۔ ارتقائی عمل کی ابتدا ہو چکی تھی۔

"صاحب، وہ آئے ہیں۔"

"کون؟" علی امام نے ٹیلی فون کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے فریمر سے پوچھا۔

"وہی جی جو اس روز آئے تھے۔ پھر آپ ان کے ساتھ کہیں گئے بھی تھے۔"

"ارے بابا میں تو بہت لوگوں کے ساتھ جاتا رہتا ہوں۔ نام تو پوچھا ہوتا۔ اچھا بلاؤ انہیں۔"

"اوہ وہاب صاحب کیسے ہیں آپ۔ آپ کا گھر سیٹ ہو گیا۔ کتنی تصویریں لے لیں۔ آؤ بیٹھو۔ کیا لیں گے۔ چائے کافی؟"

"جی میں ایک کام سے آیا تھا۔"

"تمہارا یہاں آنے کی ایک وجہ تو مجھے معلوم ہے۔"

وہاب کا چہرہ بلاوجہ سرخ ہو رہا تھا۔

"جوانی میں کبھی لڑکے کام ہی کے بہانے آتے ہیں۔"

"جی میں ... "

علی امام نے بات کاٹی۔ "تمہارا قصور نہیں لڑکیاں خوبصورت ہیں۔"

"نہیں ... سر، میں تو آپ کی شاگردی میں آنا چاہتا ہوں۔"

"آر یو سیریس۔ ایک تاجر صنعت کار پینٹنگ سیکھنا چاہتا ہے۔"

"سر سیاسی حالات آپ کو معلوم ہیں۔ انڈسٹریز پرائیویٹائز ہو گئی ہیں۔ میں آج کل فارغ ہوں۔ کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔"

"پلیز ڈونٹ مائنڈ۔ میں مذاق کر رہا تھا۔ اگر تم پینٹنگ سیکھنا چاہتے ہو تو میرے لیے خوشی کی بات ہے۔"

"فیاض" امام نے فریمر کو آواز دی۔ "اسٹوڈیو میں ایک کرسی اور لگا دو۔"

"ٹھیک ہے سر میں کل سے آؤں گا۔"

تمہاری مرضی ویسے چاہو تو آج ہی سے بیٹھ جاؤ۔ کلاس جاری ہے۔"

چیسر بات کا ریلوے پھاٹک اتفاق سے آج کھلا تھا۔ ورنہ کوئی ٹرین گزرنے والی ہو تو بڑی دیر تک رکنا پڑتا تھا۔ اس نے ریلوے کراسنگ کے بعد سیدھے ہاتھ کو مڑ کر اپنی فیٹ 600 ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے روکی۔ دروازے کی گھنٹی

بجائی تو ناہید کی آواز آئی۔

"ارے ہاں عینی مقصود آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔"

عینی کمرے میں داخل ہوئی تو مقصود علی ایزل پر اپنی ادھوری تصویر میں رنگ لگا رہے تھے۔

کچھ عرصہ قبل ناہید رضا اور مقصود علی شادی کے بندھن میں آ چکے تھے۔ دونوں آرٹسٹ تھے۔ اس لیے ان کا اپنا اور دوست احباب کا خیال تھا کہ یہ بڑا اچھا جوڑ ہے۔ میاں بیوی ساتھی ایک ہی پروفیشن میں ہوں تو رفاقت خوشگوار رہتی ہے۔ گفتگو کے موضوعات مشترک ہوتے ہیں۔ ذہنی ہم آہنگی گھریلو ماحول کو پرسکون رکھنے میں معاون ہوتی ہے۔ یہ سب ناہید اور مقصود کے مختصر سے گھر میں نظر آ رہا تھا۔

"آپ لوگ باتیں کریں۔ میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔" ناہید نے اپنے مخصوص بے تکلف انداز میں عینی سے کہا۔ مقصود علی اپنی اگلی نمائش کی تیاری کر رہے تھے۔

"آپ کام ختم کر لیں۔ میں آپ کی تصویریں دیکھتی ہوں۔" عینی نے دیوار کے ساتھ لگی رکھی ہوئی تصاویر کو دیکھنا شروع کر دیا۔

مقصود علی کا طرزِ مصوری اپنے گرد و پیش میں رنگا ہوا اور اپنی ثقافت میں رچا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ وہ جدید تقاضوں کا شعور بھی رکھتے تھے جس سے روایت اور جدت کے مابین قریبی تعلق قائم ہوا تھا۔ لیکن وہ اپنی روش میں یکسر تبدیلی لانے سے کتراتے رہے کہ وہ کوئی شدید سوال نہیں لینا چاہتے بلکہ ایک تکمیل کی از سرِ نو تشکیل کرتے ہیں۔ نئی کینوس پر کام کرتے وقت، اس سے پہلے کی کینوس کی پرچھائیں ان کے تعاقب میں رہتی ہیں۔ فن کے اولین دور میں مقصود کے ہاں رنگوں کی آمیزش لطیف تاثر پیدا کرتی تھی۔ تاریکی سے روشنی کی جانب بتدریج بڑھنے کا عمل۔ حقائق اور بردباری کا عکس۔ پھر وہ آئل کلرز کے بجائے ایکریلک کے میڈیم کی طرف آئے۔ اپنی پیلٹ بنانے کے بجائے رنگوں کو ٹیوب سے براہ راست استعمال کرنے لگے۔ وہاں شوخ رنگ، چکا چوند کرنے والے رنگ ابھرے، جیسے پتنگوں اور غباروں کے رنگ۔ وہ سب کچھ چونکاتا تھا۔ وہاں تحیر اور فسوں انگیزی نہیں تھی۔ تجسس پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک وقت میں مقصود علی کے بڑے ٹکڑوں سے چھوٹی چھوٹی چوکور ٹکڑیاں چٹختیں اور ٹوٹ کر بکھرتی نظر آتی تھیں۔ پھر استوڈیو میں ان فورمز کی از سرِ نو تعمیر کرتے تھے۔ مقصود علی جو کینوس کے اندر چوکھٹے کے قید و بند سے آزاد ہو کر کھلے میں آ بیٹھے تھے۔

علی امام جوتوں کے تسمے باندھ رہے تھے کہ شہناز کمرے میں داخل ہوئی۔

''کہاں کا ارادہ ہے۔'' شہناز کے ہاتھ میں چائے کا مگ تھا۔

''نرسری تک جا رہا ہوں۔ گھنٹے بھر میں لوٹوں گا۔ ہاں سنو قطب شیخ آیا ہوا ہے۔ اس کا فون آئے تو اسے کہنا کہ تصویریں بنوا دے۔ میں نے تو نو گس اقر کو کل کا وقت دیا ہے۔ وہ بہت سال بعد پاکستان آیا ہے۔ اسے سمجھانا پڑے گا کہ نمائش کی تاریخ طے ہے لیکن بروشر کی تیاری اور چھپائی میں کافی دن لگ جاتے ہیں۔''

نرسری مارکیٹ انڈس گیلری سے کچھ ہی فاصلے پر تھی۔ امام کا یہ معمول تھا۔ وہ ہفتے میں ایک آدھ بار وہاں پرانا فرنیچر، ظروف وغیرہ کی دکانوں میں دیر تک مصروف رہتے۔ کبھی کبھار انہیں دوسروں کی ترک کی ہوئی چیزوں میں سے کوئی نادر شے مل جاتی تھی۔ دکاندار مصر تھا کہ یہ لیمپ جس کی سیاہ سطح پر ابھرتے ہوئے سنہری پھول پتے تھے وہ اس نے کسی نواب کی حویلی سے حاصل کئے ہیں۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ وکٹورین دور کے ہیں۔ امام کو ان کی وضع اور بروک کے سے رنگوں کی شوخی پسند نہیں آ رہی تھی۔ معاً آواز آئی۔

''ہیلو سر، کیسے ہیں آپ۔''

''او ہینی، یار تم یہاں کیا کر رہی ہو۔''

''مجھے ایک دو چھوٹی میزوں کی تلاش تھی۔ آج کل لکڑی کی میزیں نہیں ملتیں۔ یہ پسند آئی ہے۔ اسے بس پالش کی ضرورت ہے۔''

''یہ دیکھیں'' ہینی کے ہاتھ میں تانبے کا ایک جگ تھا۔

''یہ جگ جینوئن ہے۔'' علی امام کہہ رہے تھے۔ ''یہ تقریباً سو سال پرانا ہے لیکن اس کا پیندا اصلی نہیں ہے۔ یہ غالباً دکن کے کسی کاریگر نے بنایا ہوگا۔''

دکن میں دھات گری کی ابتدا سترھویں صدی میں ہوئی۔ اسے فائن آرٹ کہا جاتا ہے۔ جنوب وسطی ہندوستان میں اس فن نے نمایاں شہرت حاصل کی۔ دکن کے شہر بیدر کے توسط سے دھاتی ظروف سازی پر خصوصی نقش و نگار کے بیدری انداز نے روایت کی صورت اختیار کی۔ ظروف میں زیادہ تر جگ، صراحیاں اور پیالے مشہور تھے۔ جن پر برگ و گل کو مستطیل اور متوازی انداز میں بنایا جاتا۔

قطب شیخ اپنی پائپ سے راکھ کو ایش ٹرے میں گراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''میں ہر دو چار سال بعد پاکستان آتا

ہے کہ یہاں ہر دوسرا شخص عدم تحفظ کا شکار ہے۔''
ہوں۔ لیکن اس بار آیا تو کئی ہفتوں تک بے چین رہا۔ مجھے یہ محسوس ہوتا

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ آپ تو کچھ عرصہ کے لیے آئے ہیں۔ واپس جرمنی چلے جائیں گے۔ ہم اس گھٹن کو کئی برسوں سے سہہ رہے ہیں۔ ملک کے سیاسی حالات عام زندگیوں کو متاثر کرتے ہیں۔ ایک تنگ نظر آمر کی حکومت ہے۔ بھٹو پر مقدمہ چل رہا ہے۔ ہر پل بے چینی میں گزرتا ہے۔ مذہبی انتہا پسندی جڑ پکڑ رہی ہے۔ فن و ثقافت پر بہت سی پابندیاں لگائی جا چکی ہیں۔'' لیلیٰ بولی تھی۔

وقت نے مصوری میں بہت سے مراحل سے گزرے ہیں۔

''میں نے تصویریں بنانی شروع کیں تو میرے رنگ تند و تیز تھے۔ میری فورمز جیومیٹریکل تھیں۔ میرے خطوط تھے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میرے اظہار میں تلخی اور کھردراپن ہے۔ مجھے پرسکون ہونا چاہیے۔ میں نے اپنے سکوں کے خطوط میں ارتعاش پیدا کیا۔ یہ وہ دور تھا جب میری کینوس پر شعلوں کی طرح بھڑکتے اور فوارے کی مانند اچھلنے والے رنگ وکش ابھرنے لگے تھے۔ وقت کے ساتھ ملاحت از خود پیدا ہوتی گئی۔''

''دیکھو، اپنی مست نظروں سے بغور دیکھو۔ تم میری پکار کی کپکپاہٹ ملاحظہ کرو۔ جو رنگوں کی صورت میں کینوس پر بکھرتی، جیسے آزادی کسی پیکر میں داخل جانے کے لیے بے قرار ہے۔ تم میری بے کلی کا مشاہدہ کرو۔ میری روح کی ذاتی تڑپ کو دیکھو۔ تصویر کے ہر گوشے سے میرا کرب لرز اٹھتا ہے۔ میری کھوکھلی آواز اور میری سچی خوشی تسلسل سے واضح صورت اختیار کرتی رہتی ہے۔ وہ رنگوں کے سایہ دار دائروں میں محسوس رہتی ہے اور گہرائیوں میں پنہاں ہوتی جاتی ہے۔''

نرم خو، کم گو لیلیٰ نے درخت والی سیریز کو انہی احساسات کے ساتھ بنایا تھا۔ لیلیٰ کی تین آنکھیں تھیں۔ وہ ہر شے کو اپنی تیسری اور اندر کی آنکھ سے دیکھتی تھی۔ درخت والی لکڑی کا ایک ٹکڑا اور درخت کی وہ شاخ جو اپنے وجود سے الگ ہوگئی ہو۔ جسے تند و تیز دھارے کے سپرد کردیا گیا ہو۔ وہ کبھی کسی چٹان سے ٹکرائی، کسی ڈھلان میں پھنسی، کہیں ناہمواری کی زد میں آ گرا تھی، لیکن بڑھتی چلی گئی۔

پی ای سی ایچ ایس کے بلاک 6 میں جھیل کے قریب لیلیٰ شہزادہ کا گھر تھا۔ جس کے باغ میں ایک ایسا گھنا درخت تھا کہ دن میں بھی وہاں گہرا سایہ رہتا تھا۔ لیلیٰ نے وہاں ایک قمقمہ لگوا دیا کہ وہ رات کے وقت اپنے گرد و پیش کو روشن رکھے۔

کاٹھیاواڑ کے ایک جیولر کی بیٹی جب تصویریں بنانے لگی تو باپ چلایا تھا کہ یہ کفر ہے۔ اسے روکو۔ لیلیٰ تصویریں بناتی رہی۔ کبھی گندھارا کے فن پر کبھی موہنجوداڑو کے موضوع پر۔

لیلی کے پاس رنگوں کا بھرپور پیلٹ تھا۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے اور اپنے موڈ کے مطابق رنگ بدلتے تھے۔ لیلی کہتی تھی۔ "گلابی، سرخ اور نارنجی رنگ جسم میں حرارت پیدا کرتے ہیں، جبکہ نیلا اور سبز رنگ آنکھوں میں ٹھنڈک پہنچاتے ہیں۔"

لیلی ہنستی سے کہہ رہی تھی۔ "ہم روزانہ کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں، میں جو اس وقت تمہارے پاس بیٹھی ہوں تو بھی بہت کچھ سیکھ رہی ہوں۔ میں جب گلگت گئی تھی تو وہاں بھی بہت کچھ سیکھا۔"

"یہ دیکھو۔" لیلی نے اپنی ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ ایک لینڈ اسکیپ تھی جس میں فطری منظر کی تشکیل کی گئی تھی۔ بہتا ہوا پانی، سخت گیر چٹانوں سے ٹکراتا اپنا راستہ بناتا ہوا پہاڑی دھارا۔ تصویر میں نیلا رنگ نمایاں تھا۔

"یہ تصویر میری دیگر تصاویر سے مختلف ہے۔ میں لینڈ اسکیپ پینٹر نہیں ہوں لیکن گلگت کے سحر انگیز ماحول نے مجھے مجبور کیا کہ میں یہ تصویر بناؤں۔"

سامنے لین سے ایک ٹیکسی الٹے ہاتھ کو مڑی۔ اور اسٹوڈیو گیلری کے سامنے آکر رک گئی۔ سفید پتلون اور شوخ رنگ کی قمیص پہنے ایک خوش شکل دراز قد نوجوان اترا۔ ٹیکسی کی چھت پر بہت سی کینوس رکھی تھیں۔ وہ مصور لگتا تھا۔ وہ اپنی تصویریں اٹھا کر گیلری کے برآمدے کی طرف بڑھا۔ اندر گیا، کچھ دیر کو رکا۔ اب وہ اپنی تصویریں لے کر باہر کی طرف جا رہا تھا۔

"کیا ہوا؟"

"امام صاحب نے کہا ہے کہ مناسب وقت پر میں تمہیں خود بلاؤں گا۔"

فنکارانہ مزاج کا لاابالی سا مصور بننا چاہتا تھا۔ وہ پہاڑ کی بلندی پر کھڑا ہو کر نیچے دیکھتا تو اسے ڈھلوان پر صنوبر کے پیڑوں کی چوٹیاں مسحور کرتیں۔ وہ ان کی خاکہ کشی کرتا۔ پھر وہ منظر سے غائب ہو گیا۔ وہ وہیں چلا گیا تھا۔ اس کے اندر کا مصور کہاں گیا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا۔

بنگال کی سلونی رنگت والے منصور راہی کے چہرے سے ہمیشہ ایک متین ذہانت منعکس ہوتی تھی۔ وہ کسی ایک موضوع پر درجنوں تصاویر بناتا تھا۔ فوکس ایک ہونے کے باوجود وہ اپنی ساخت اور رنگوں کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف اور متنوع نظر آتی تھیں۔ جب وہ راجشاہی کے اسکول میں پڑھتا تھا تو اپنی سلیٹ پر عبارت کے بجائے خاکے بنانے لگتا۔ اس نے مصوری کی تربیت حاصل کی تو یہی سیکھا کہ نظر آنے والی شے کی ہو بہو شبیہ کیسے بنائی جاتی ہے۔ وہ ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد اکسپریشنسٹ بنا۔ اس کے استاد زین العابدین نے کہا تھا کہ "جب تک اصول بنانا نہ سیکھو اسے توڑنے کی کوشش نہ کرو۔"

جب تم بنیادی اصول ہوتا سیکھ جاؤ گے تو پھر انہیں توڑنا اور نئے اصول ہوتا صحت مند بات ہوگی۔ روایت میں جدت تمہاری اپنی تخلیق ہوگی۔"

راہی کسی ایک لمحہ سے تحریک حاصل کرتا تھا۔

لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ دیکھنے گیا تو وہاں نے کہا سر! صاحب لیں۔ پھر کہا جوتے اتاریں۔ راہی کے لیے یہی کافی تھا۔ مغرور بادشاہ کے عنوان سے تصویروں کا سیریز بنانے کے لیے۔

جنگلی گھوڑا کے موضوع پر راہی کی تصویریں زیر نمائش تھیں۔

راہی نے گھوڑے کی پورٹریٹ نہیں بنائی۔ بلکہ اس کے جسم کے خدوخال کو الگ الگ کر دیا۔ ان کے بقول گھوڑا حرکت کی علامت ہے۔ منصور نے اس کے چہرے اور سموں کو بطور استعارہ استعمال کیا۔ ملکی حالات سے تحریک ملی۔ ہر کوئی سرپٹ بھاگ رہا ہے۔ کوئی کسی کی بات نہیں سنتا۔ کوئی تو جیہ کارگر نہیں ہوتی۔

"فن کے ارتقا کے لیے کون سا ماحول سازگار ہے۔" یعنی کا سوال تھا۔

"یا تو ماحول میں سکون ہو یا جوش۔ لیکن ہمارے ہاں ایک جمود سا ہے۔ نہ سکون ہے نہ جوش۔ جمود تخلیقی فن کی ہر صنف کے لیے نامناسب ہے۔ ایک بے یقینی ہے۔ سکوت ہے۔ سکون نہ سہی تو کوئی جدوجہد یا جنگ وجدل ہو تو فن تخلیق ہوتا ہے۔ نذرالاسلام نے خندق میں بیٹھ کر بہت اچھی شاعری کی تھی۔

راہی نے فورمز میں ربط اور توازن پیدا کرنے کے لیے اپنی گرامر وضع کی۔ ان کی کینوس کے 3 چوتھائی حصے کے رنگ دھیمے اور صوفیانہ جبکہ ایک چوتھائی حصے میں کچا سرخ، کچا سبز اور کچا زرد استعمال کیا جس سے منفرد تاثر قائم ہوا۔

منصور راہی ڈھاکہ سے مختصر عرصے کے لیے مغربی پاکستان آئے تھے۔ اس دوران رابعہ زبیری اور ہاجرہ سے ملاقات کے بعد ان کے ادارے مینا آرٹ ایجوکیشن سوسائٹی سے بطور لیکچرر منسلک ہو گئے۔ اسی عرصے میں ہاجرہ کی محبت میں گرفتار ہوئے اور ان سے شادی کر لی۔ جب مینا آرٹ کا نام کراچی اسکول آف آرٹ ہوا تو وہ اس کے پرنسپل ہو گئے۔ مگر کچھ عرصے بعد پنڈی چلے گئے اور وہیں مستقل ٹھکانہ بنالیا۔ ایک بار کراچی آئے تو کہا کہ اب کراچی کیا آنا۔ یہاں تو ہوا کی گرج بھی نہیں ہے۔" انہیں اپنے دیش کے سبزہ زاروں اور شمالی پنجاب کی برساتوں میں لہلہاتے اور نکھرے ہوئے مرغزاروں میں مماثلت نظر آتی تھی۔ وہ وہاں ایٹ ہوم محسوس کرنے لگے تھے۔

پہاڑ کی بلندی، وادی کی وسعت، بدلتے ہوئے موسم اور نباتاتی تنوع دھرتی کو حسن بخشتے ہیں۔ راہی اور ہاجرہ کے طرز

مصوری اور موضوعات کے امتزاج نے ان کی فنی زندگی میں استحکام پیدا کیا۔ راجی کو طاقتور کا دبدبہ اور غریب کی بے بسی بے چین کرتی۔ جبکہ ہاجرہ زندگی کی رعنائیوں سے سرشار ہوتیں۔ ان کے یہاں ہر چیز، ہر نقش رومانیت میں بھیگا ہوا ہے۔ نرم و ملائم ریشم کی مانند۔ ایلورا اجنتا میں جاتک کہانیوں کے نسائی کرداروں کی غزالی آنکھیں، حسن کی بازگشت چغتائی کے فن میں دکھائی دیتی رہی۔ صنف نازک کی دلربائی، چہرے پر رکی ہوئی مسکراہٹ، زلفوں کو چھیڑتے ہوئے ہوا کے جھونکے۔ ان کے رنگوں میں ملاحت اور نقوش میں سبک روی ہے۔ یہی ہاجرہ منصور کی تصویروں کی اساسیت ہے جو مختلف وقتوں میں مختلف انداز میں سامنے آتی ہے لیکن یکسانی کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔

عینی نے جناح اسپتال کے امراض قلب کے شعبے کے ایمرجنسی وارڈ کے سامنے گاڑی روکی۔ اشارے سے نرس کو بلایا۔ وارڈ بوائے پھرتی سے وہیل چیئر کو دھکیلتا ہوا گاڑی تک پہنچ گیا۔ مریض کو بٹھایا۔

ریسپشنسٹ کا سوال تھا۔ ”مریض کا نام؟“

”جی علی امام“

”آپ ان کی کیا ہیں؟“

”جی میں دوست ہوں۔“

کچھ دیر پہلے عینی کے دفتر کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو اس طرف ڈاکٹر آسیہ تھیں۔

”علی امام کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انھیں فوری اسپتال پہنچانا ضروری ہے۔ شہناز کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئی ہوئی ہیں۔ بچے اسکول میں ہیں۔ ان کے فریمر کا فون آیا تھا۔“

ڈاکٹر نے پریشانی میں ایک سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔

”تو ——“

”میں ان کا چیک اپ کر کے آئی ہوں۔ انھیں کارڈیو لے جانا ہوگا۔“

علی امام اچانک عینی کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ عینی نے انھیں زیادہ بات کرنے سے روکا اور گاڑی میں بٹھایا۔

”زیادہ گھبرانے کی بات نہیں۔“ ڈاکٹر نے تسلی دی۔ ”لیکن انھیں داخل کروانا ہوگا۔ میں نے انجکشن لگا دیا ہے۔“

عینی وہاں رکی رہی کہ ای سی جی کی رپورٹ آجائے۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا انھیں ایک رات کے لیے یہاں ضرور ٹھہرنا ہوگا۔

علی امام اپنا والیٹ نکالتے ہوئے کچھ دیر رکے۔ والیٹ میں اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ پرائیویٹ وارڈ میں رہ سکتے۔ عینی

سے کہا کہ انہیں جنرل وارڈ میں داخل کر لیں۔

”لیکن یہاں آپ بے آرام ہوں گے۔ کچھ پیسے میرے پاس ہیں۔ آپ ......“

علی امام نے عینی کو روکا۔ ”دیکھو، یہاں دوسرے لوگ بھی ہوں گے۔ الگ کمرے میں میں اکیلا ہوں گا۔“

عینی واپس گیلری چلی گئی۔ بچوں کو تسلی دی کہ ابو کی فکر نہ کریں۔ وہ اب ٹھیک ہیں۔

”لیکن آپ کو کیسے پتہ چلا۔“ احسن کا سوال تھا۔

عینی نے بتایا کہ ”ابو اور ہماری ڈاکٹر ایک ہی ہے۔ ان کا فون آیا تھا۔“

”لیکن انہوں نے آپ کو فون کیوں کیا؟“ احسن کا دوسرا سوال تھا۔

عینی احسن کو ڈانٹتے ہوئے بولی۔ ”احسن تم ہمیشہ الٹے سیدھے سوال کرتے ہو۔“ ”تم عینی آنٹی کو نہیں جانتے۔“

”جانتا ہوں۔ لیکن ......“

”احسن تم ابو کی وجہ سے پریشان ہو۔ میں نے امی کو فون کر دیا ہے۔ وہ حیدرآباد سے چل پڑی ہیں۔ ماموں اسپتال پہنچ گئے ہیں۔“ احسن بہن کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر تلملا رہا تھا۔

”نہیں، میں مصور نہیں بننا چاہتا تھا۔ مجھے ایسا کوئی شوق نہیں تھا۔ میں تو کہانیاں لکھتا تھا جو ادبی رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔“

”میں اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتا تھا۔ ایک روز کافی ہاؤس میں دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے خیال آیا کہ دنیا بھر کے لوگ بیرون ملک جاتے ہیں۔ ہم کیوں نہیں جاتے۔ ان دنوں ترقی پسند تحریک چل رہی تھی۔ علامتی افسانے لکھے جانے لگے تھے مگر موضوعات وہی گھسے پٹے تھے۔ سوچا سفر کروں گا تو مجھے اپنی کہانیوں کے لیے نئے موضوعات مل جائیں گے لیکن جب میں لندن پہنچا تو وہاں کچھ عرصے کے لیے میرا اردو سے ساتھ چھوٹ گیا۔ پھر یہ بھی تھا کہ اردو میں کہی ہوئی بات محدود حلقے تک پہنچ سکتی ہے۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں ایسی عالمی زبان سیکھ لوں جو ہر ایک کی سمجھ میں آئے۔ یہ تصویر کی زبان ہے۔ اور میں تصویریں بنانے لگا۔“

تصدق سہیل رنگ و نقش کی زبان میں کہانیاں بنانے لگے جن کے کردار علامتی تھے۔ پراسرار تھے۔ جنگل کے پس منظر میں ہاتھی ایک چھوٹے سے پرندے کے سامنے اپنی سونڈ لٹکائے کھڑا ہے۔ ہاتھی طاقت کی علامت ہے۔ پرندہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہے۔ وہ ہاتھی سے زیادہ پراعتماد نظر آتا ہے۔ اس میں جرأت اظہار ہے۔ سہیل کے ہاں وہ ماورائی عناصر بھی

ہیں۔ دو گلدان، ایک خالی دوسرے میں پھولوں کی رعنائیاں۔ زندگی میں حسن کا اقرار، درختوں کے جھنڈ سے باہر دو پرندوں کی گفتگو۔ تمہارا کیا مطلب ہے کہ تم کسی اور کے ساتھ بھی جا سکتے ہو۔ محبت میں احساس ملکیت خود مختاری اور انفرادیت کا امتزاج۔

پارٹی آن تھی۔ مہمانوں کا مکالمہ فضا میں گھلا تھا۔ ہاتھوں میں مشروبات لیے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے ہوئے مصور، صحافی، ادیب آمریت کے دیے ہوئے زخموں کو بہلا رہے تھے۔

''ارے بھئی یہ دعوت تو تصدق کے لیے تھی۔ وہ کہاں ہے۔ وہ تو غائب ہے۔''

''آ جائے گا۔ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ اندرون سندھ گیا ہے۔ اس نے کہا تھا شام کو لوٹ آئے گا۔''

تصدق کنٹل آیا تو اس کے جوتے اور سر کے بالوں پر دھول اٹی تھی۔

''کیا ہوا؟''

''مجھے نہیں پتہ تھا کہ وہ تیتر کے شکار کے لیے جا رہے ہیں۔ جب وہ کندھوں پر بندوقیں لٹکا کر نکلنے لگے تو میں نے ان کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔ وہ اصرار کر رہے تھے مگر میں نظر بچا کر بھاگ نکلا۔ میلوں پیدل چلتا ہوا سڑک پر آیا اور ایک بس پکڑی۔ یار ہم تو پرندوں سے محبت کرتا ہوں اور وہ انہیں مارنے کی گیم کھیلتے ہیں۔ یہ سب میری برداشت سے باہر تھا۔''

تصدق کی جنگل بک ہر بار نئی کہانیاں لیے ہوتی ہے۔ ان کے اسلوب میں شدید تبدیلی نہیں آتی۔ لیکن وہ خود کو دہراتے نہیں ہیں کہ ان کے پاس موضوعات کا کثیر تنوع موجود ہے۔ ایرانی منی ایچرز کے بارے میں کسی نے کہا تھا کہ اگر ان تصویروں کا پس منظر معلوم نہ ہو تو اس کا آدھا تاثر زائل ہو جاتا ہے۔ ایرانی مصور فردوسی کے شاہنامے اور سعدی کی گلستان سے حکایتیں اٹھاتا ہے۔ تصدق جو کچھ بناتا ہے وہ اس کا اپنا مشاہدہ ہے۔ وہ حالات حاضرہ کے قطعات بناتا ہے۔ جزئیات نگاری تصدق کا مخصوص وطیرہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی شریانوں کا تکنیکی منظر کو گہرائی دیتا ہے۔ ان کے چہروں پر دلربائی یا ملامت کے بجائے گمبھیر سنجیدگی اور متانت آپ کو نہ صرف متجسس کرتی ہے بلکہ اپنے سوال کا جواب بھی طلب کرتی ہے۔ تصدق جو بظاہر نرم خو اور نرم گو لگتے ہیں، ان کے اندر کی وحشتیں مختلف علامتی پیکروں کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ خود رو گھاس کی نوکیلی شاخیں، خاردار جھاڑیوں کے جھرمٹ اور گھنے پیڑ۔ یہ تاثراتی تصویریں توہم پرستی اور بندشوں کے خلاف، احتجاج اور طنز و مزاح کی عکاس ہیں۔

کراچی اسکول آف آرٹ کے اسٹوڈنٹس کی تصاویر کی سالانہ نمائش کے مہمان خصوصی علی امام تھے۔ رابعہ نے فون کیا تو

معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ اس لیے وہ نہیں آسکیں گے۔ رابعہ زبیری مایوس ہو گئی تھیں۔ علی امام اکثر و بیشتر اسکول کے بچوں کو آرٹ پر لیکچر دیتے تھے۔ رابعہ نے ہمیشہ یہ اعتراف کیا کہ اگر میں نے بچوں کو آرٹ بنانا سکھایا تو امام صاحب نے انہیں آرٹ کو سمجھنا سکھایا۔

"اوہ۔ اب کیا کریں۔ کس سے رابطہ کروں۔ ویسے بھی کوئی بڑا آرٹسٹ اتنے کم نوٹس پر نہیں آئے گا۔ یہی ہو سکتا ہے کہ تاریخ ملتوی کر دیں۔ یہ بھی اچھا نہیں لگے گا۔" رابعہ اسی ادھیڑ بن میں تھیں کہ ایک اسٹوڈنٹ بھاگتا ہوا آیا۔

"میڈم سر آ گئے۔"

"کون سر——"

"میڈم سر علی امام۔"

رابعہ لپک کر گیٹ کی طرف گئیں، دیکھا تو علی امام ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر بقیہ رقم والیٹ میں رکھ رہے تھے۔ رابعہ کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ آس پاس کھڑے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کے چہرے دمک اٹھے تھے۔

امام آگے بڑھے۔

"آپ آ گئے۔ بہت شکریہ۔" رابعہ نے استقبال کیا۔

"آئے بنا چارہ نہیں تھا۔ بہت دنوں سے بچوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں ان کا نیا کام دیکھنا چاہتا تھا۔"

ایک بار جب رابعہ نے احمد پرویز کے سامنے نیشنل اسٹیڈیم کے قریب گلشن اقبال میں کراچی اسکول آف آرٹ کا ذکر کیا تو کہنے لگے۔ "مڈل کلاس میں آرٹ نہیں چلتا۔ اسے کلفٹن یا ڈیفنس کے علاقے میں لے جاؤ۔"

"کلفٹن اور ڈیفنس میں تصویر بکتی ہے۔ بنتی نہیں۔" رابعہ نے سوچا تھا۔

رابعہ کے مڈل کلاس کے اسکول نے لبنیٰ منظور، رفعت علوی، ذہین احمد اور الطاف جمال پیدا کیے۔ وہاں اس طبقے کے بچے آرٹ پڑھتے ہیں جو بڑے اداروں کی فیس نہیں دے سکتے۔

علی کے سامنے رابعہ کا جو مجسمہ تھا اس کے خد و خال میں روانی اور زیر و بم میں ملاحت تھی۔

"ارے اس میں ہنری مور دکھتا ہے۔"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں کی عورت دوپٹہ اوڑھ کر اسی انداز میں بیٹھتی ہے۔"

ہنری مور نے نیم تجریدی مجسموں کے وسیلے سے انگلینڈ میں جدید فورم کو متعارف کروایا۔ اکثر لوگوں کو مور کے نیم

دراز، جھکتے، لگتے ہوئے مجسموں میں کوئلے کے کان کن کے بیٹے کے آبائی علاقے یارک شائر کی لینڈ اسکیپ اور پہاڑیوں کی جھلک نظر آتی ہے۔

قدیم ثقافتوں میں مجسمہ سازی مذہبی عقیدت اور سیاسی ستائش کا اظہار تھا۔ اس فن کی ابتدا یونان میں ہوئی اور پھر بحیرہ روم کے ملحقہ ممالک کی تہذیبوں کے علاوہ ہندوستان اور چین تک افزائش ہوئی۔ پورٹریٹ اسکلپچر کا آغاز مصر میں ہوا۔ وقت کے ساتھ قدیم یونانی ایستادہ مجسموں کے چہروں کی سخت گیری اور حرکت کا تکلف دور کے مجسموں میں نرم پڑ گئی۔ انسانی جسم کی اناٹمی اور مجسمے کے مابین مطابقت دریافت ہوئی اور ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ مائیکل اینجلو کا ڈیوڈ مجسمہ سازی میں روایت سے انحراف اور جدت طرازی کی مثال ہے جبکہ ہنری مور کے فن میں اسکلپچر اور آرکیٹیکچر کا اتصال ہے۔

رابعہ بنیادی طور پر اسکلپٹر ہیں۔ انہوں نے اس فن کی تربیت لکھنؤ اسکول آف آرٹ سے لی۔ ان کے ابتدائی کام میں ہندوستان کے روایتی فن مجسمہ سازی کی گواہیاں ملتی ہیں۔

بدھ ازم مجسمہ سازی کو ہندوستان میں لایا اور ارتقائی عمل میں دونوں عقیدوں کی لیلائیں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئیں۔ موریہ حکمران اشوک کا دور فن و ثقافت کے لیے بہت سازگار تھا۔ برصغیر کے شمال میں اسکندر کی کولونائزیشن کے ساتھ قدیم یونانی فن مجسمہ سازی کے اثرات ہندوستان کی تہذیب میں شامل ہوئے تو انڈو گریک آرٹ نے نمو پائی۔ تاہم چندر گپت کے دور حکومت میں انڈین آرٹ نے اس وقت اپنی پہچان بنائی جب منتشر اور متفرق عناصر اور موٹفس کی آمیزش سے ایک متوازن طرز فکر اختیار کیا گیا تھا۔ گپتا اسکلپٹر نے غیر ملکی جزیات کی تخفیف کے بعد ہندوستانی موٹفس کو اجاگر کیا۔ اس عرصے میں آرٹ کے دو مکاتب فکر، گندھارا آرٹ اور متھرا آرٹ تشکیل پا چکے تھے۔ متھرا اسکول آف آرٹ میں ہندو ازم کے دیومالائی کرداروں اور روحانیت کا عکس تھا۔ جبکہ گندھارا آرٹ میں یونانی ہیئتوں اور لباس، مقامی چہروں کے خدوخال اور لبادوں کا امتزاج تھا۔

رابعہ زبیری انڈس گیلری میں تصویری نمائش سے بطور پینٹر سامنے آئیں۔ ان کی تصاویر اور خاکے دراصل مجسمہ سازی کی توسیع ہیں۔ مجسمے کی تشکیل کرتے ہوئے وہ پرامید ہیں تو تصویر کے نقوش متحرک، اظہار واضح اور بامعنی ہے۔

رابعہ کے ہاں وقت کی لینڈ اسکیپ ہے۔ وہاں حقیقت اور تخیل کا امتزاج ہے۔ وہ ہر طرح کے موسم کی شدت اور راحت کو محسوس کرتی ہیں۔ چاہے وہ کسی آمر کی تنگ نظری ہو، سیاسی معیشت کی ناہمواری ہو، ملکی یا بین الاقوامی بدامنی ہو، ان کی زندگی کا پانیواں موسم تنہائی آباد رہتا ہے۔ جب زندگی کا کل ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے۔ پاؤں کیچڑ میں لتھ پتھ، ہاتھ میں تھیلا اور سر پر انگاری مگر چہرے پر پیاسیت نہیں۔ رابعہ کے کردار طویل قامت ہیں۔ وہ نامساعد حالات اور غربت میں بھی پروقار انداز میں زندگی کرتے ہیں۔

ہفتے کی صبح۔ دس بجے تھے۔ امام نے نیلی دھاریوں والی قمیص اور کورڈ رائے کی پتلون پہنی۔ ہوا میں کچھ خنکی تھی۔ انہوں نے وارڈ روب کھول کر ہینگر سے لٹکتا ہوا کارڈیگن نکالا۔ ہفتے کو بچوں کو لے کر برٹش لائبریری جانا ان کا معمول تھا۔

"عظمیٰ آپ لوگ تیار ہو گیا؟" امام نے بچوں کو آواز دی۔

"جی ابو۔"

کچھ دیر کو خاموشی رہی۔ امام برآمدے میں کھڑے فریحہ کو کچھ ہدایات دے رہے تھے۔ بچے ابھی تک باہر نہیں آئے تھے۔

"عظمیٰ، چلو بھئی کیا کر رہے ہو۔ ایک بجے سے پہلے واپس آنا ہے۔ ایک بازو کو جانا ہے۔" باپ کی آواز سن کر عظمیٰ باہر آئی۔

"احسن کہاں ہے۔ اس نے ناشتہ کر لیا؟"

"میز پر بیٹھا ہے۔ کہہ رہا ہے مجھے لائبریری نہیں جانا۔"

"کیوں۔"

"آپ خود ہی پوچھ لیں۔"

"اس کا کوئی اور پروگرام ہوگا۔ اچھا میں دیکھتا ہوں۔"

"نہیں ابو، آپ کچھ نہ کہیں۔ کہہ رہا تھا لائبریری کی تمام کتابیں انگریزی میں ہیں اور مجھے اتنی انگریزی نہیں آتی۔"

جالی کا دروازہ کھلا اور احسن باہر آیا۔

"نہیں ابو میں نے کچھ نہیں کہا۔ یہ جھوٹ بولتی ہے۔" اس شام احسن کو یہ سزا ملی کہ اسے ابو کی دی ہوئی عبارت کو سو مرتبہ لکھنا تھا۔ ابو نے کہا تھا کہ "اگر کسی لفظ کے ہجے غلط ہوئے تو اسے پھر سے سو مرتبہ لکھنا ہوگا۔"

زیرِ زمین بجلی، چھینیاں، ہتھوڑیاں، لوہے کی زنجیریں، کنڈے چھنے، دھول آلود دیواریں اور چھت۔ شاہد سجاد اپنی ورکشاپ سے باہر نکل آئے۔ علی سے کہا۔ ''چلیں اوپر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

شاہد سجاد کے فن کی ابتدا مشرقی پاکستان کے جنگلوں سے ہوئی جہاں وہ طویل عرصے سے مچھیروں کے ایک قبیلے کے ساتھ رہ رہے تھے اور انہی کی عورتوں کا پکا ہوا کھانا کھاتے۔ اپنا دن لکڑیاں کاٹنے والوں کے ساتھ گزارتے اور ان کے اوزاروں سے لکڑی کو تراش کر مجسمے بناتے۔ پھر وہ اپنے فن کے احیا کے لیے موٹر سائیکل پر یورپ اور ایشیا کے ملکوں ملکوں گھومتے رہے۔

شاہد نے اپنا میڈیم بدلا تو دھات میں کام کرنے لگے۔ وہ طویل عرصے تک کانسی کی میورل کی تیاری میں مشغول رہے۔

''وہ ایک بہت محنت طلب کام تھا۔ اسے مکمل کیا تو میں کچھ آرام کرنا چاہتا تھا۔ ایسا کام کرنا چاہتا تھا جس میں جسمانی مشقت کم ہو۔ میں نے 20 برس سے کاغذ پر کام نہیں کیا تھا۔ ایک روز میں نے بے خیالی میں کاغذ پر ویکس کا کوٹ لگا کر چھینی سے کھرچنے لگا اور خاکوں کی لکیروں میں رنگ بھر دیئے۔ میں لاشعوری طور پر مختلف سمت اختیار کرنا چاہتا تھا۔ میں نے مختلف ٹیکسچر اور جاذبیت کے لیے کئی میڈیم استعمال کیے۔ پلاسٹر آف پیرس نے مجھے ایک نئی سمت دی۔ کیونکہ یہ کاغذ پر پھیلے ہوئے رنگ کو چوس لیتا ہے۔ وہاں خاکوں کے وہ نقوش باقی رہ جاتے ہیں جو پلاسٹر کے بلاک پر کھودے گئے تھے۔''

شاہد مجسمہ سازی میں بہت سے حقیقت نگار تھے کیونکہ ان کے سامنے ایک ماڈل ہوتا تھا۔ جس کے خدوخال کی شباہت قائم رکھنا ضروری تھا۔ لیکن پلاسٹر پرنٹنگ طبع زاد ہے۔ ان کے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں۔ امیجز کی اسکیچنگ میں شاہد کے ہاتھوں کا وہ استحکام، مشق اور مہارت شامل ہے جو کئی برسوں سے پیکر سازی میں مصروف رہے۔

مونوکرومیٹک یہ فن پارے ایک ہی رنگ کے کئی شیڈز کے امتزاج ہیں۔ انسانی جسم کے خاکے کبھی کبھار نباتاتی موٹفس کے جلو میں نظر آتے ہیں۔

''یہ سب بکھرے ہوئے پیکر ہیں۔ فوسلز۔'' شاہد کہہ رہے تھے۔

''کیسے؟''

''ہم جس ماحول اور جن حالات میں رہ رہے ہیں، وہ چاہے ہماری کل زندگی ہو، ہمارے خواب ہوں یا ہماری توانائیاں، وہ سب سلب ہو کر رہ گئی ہیں۔ ساکت ہو چکی ہیں۔ میری ان تصویروں کے پیکر کی مانند۔

امام نے اسٹوڈیو کے شیلف میں رکھی پیتل میں سے ایرا کی ایک مورتی اٹھائی۔ کاریگر نے تانبے کے اس مجسمے کو نہایت محنت اور عقیدت سے بنایا تھا۔ اس کے لباس، زیورات نے اس کے جسم کے خدوخال کو مزید دلکش بنا دیا تھا۔ اعضا کا تناسل نکھر گیا تھا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ ان کا میوزیم تھا۔ جس کی ہر شے کا فنون لطیفہ کے ساتھ رشتہ جڑا تھا۔ مغل دور کے چوڑے کے سکے، کشمیر کے فن خطاطی کے اوراق، افریقی ماسک، کرشن اور شیو کے مجسمے ...... غور سے دیکھو تو فکر کے کئی در یچے کھلتے چلے جائیں۔

گیلری کے دروازے کے کھلنے اور کھٹ سے بند ہونے کی آواز آئی۔ امام نے چونک کر دیکھا۔ دین محمد اپنے کندھے پر بڑا سا تھیلا اٹھائے ہوا تھا۔

"ارے دین محمد، بہت دن بعد آئے۔"

"جی سر میں تھرپارکر چلا گیا تھا۔ آپ کے لیے ایک نایاب چیز لایا ہوں۔"

"آؤ، کیا لے آئے۔"

دین محمد اسٹوڈیو کے فرش پر بیٹھ کر اپنے تھیلے کو کھولنے لگا۔ اس کے اندر سے کاغذ میں لپٹا ہوا نندی کا مجسمہ نکالا۔ "سر یہ بالکل اصلی ہے۔ جب سے مندر کا پروہت آنجہانی ہوا ہے اس کے بیوی بچوں کو بہت پریشانی ہے۔ اس کی بیوی کو نندی بہت پیارا تھا۔ لیکن مجبوری میں بیچنا چاہتی ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم اسے چھوڑ جاؤ میرے پاس اس وقت رقم نہیں ہے کہ تمہیں دے سکوں۔ شام کو وہاب آئے گا تو اس سے بات کروں گا۔ مجھے یقین ہے وہ اسے خرید لے گا۔"

"جی سر، آپ اسے رکھ لیں۔ میں اگلے ہفتے آؤں گا۔"

"فکر نہ کرنا۔ میں اس کا کچھ کروں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ بہت ضرورت ہے۔"

"کوووو......" منلکی کمرے میں آئی۔ "ہاؤ کیوٹ"

امام ہنسنے لگے۔ "ارے بھئی بات تو پوری کرو۔"

"اوہ سوری"

"یہ سنو بابا، یہ نندی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے ابو۔ میری دوست کلپنا کے گھر میں بھی ایسا ہی ایک چھوٹا سا نندی ہے۔ مگر وہ تو سفید ہے۔ کہہ رہی تھی اس کے ڈیڈ ہندوستان سے لائے تھے مجھے اس نے بتایا تھا۔ نندی لارڈ شیوا کا دربان تھا۔ وہ اس پر سواری بھی کرتے تھے۔"

”ہاں ٹھیک ہے۔ میں نے بھی ہندوستان میں شیو مندروں میں بیٹھے ہوئے نندی کو دیکھا ہے۔ ان میں اکثر عورتیں نندی پر پھول چڑھاتیں اور اسے چھو کر دعا مانگتی تھیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ نندی زرخیزی کی علامت ہے۔ اسے چھونے سے ان کے ہاں اولاد ہو جاتی ہے۔“

شمزا کا نام سنا ہے۔ کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ دیکھا بھی نہیں۔

وہ یہاں تھا ہی نہیں۔ عرصہ ہوا ملک چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

مگر یہ شخص، جس نے یہ تصویریں بنائی ہیں وہ تو کبھی یہاں سے گیا ہی نہیں۔ وہ اس سرزمین سے کبھی الگ نہیں ہوا۔ جس کا شعر یا اپنی مٹی سے پھوٹتا ہو۔ اس کا خمیر اس کی حرارت اور رطوبت سے اٹھا ہو جس پیڑ کی جڑیں مٹی کے اندر تک چلی گئی ہوں۔ اسے اکھیڑنا ممکن نہیں ہوتا۔

شمزا نے اپنی برطانوی بیوی میری سے کہا تھا ”بہت عرصہ یہاں رہ لئے۔ اب واپس چلتے ہیں۔ سوات میں رہیں گے۔ لاہور آتے جاتے رہیں گے۔“

زندگی کے آخری ایام میں انور جمال شمزا کے ذہن پر اپنی اساسیت کی دھن سوار تھی۔ پھر وہ اسی کی یاد میں تصویریں بنانے لگے۔

میری کہہ رہی تھی۔ ”میں انور کی یہ تصویریں خود سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن امام کا اصرار تھا کہ میں انہیں نمائش کے لیے پاکستان لے آؤں۔“

عربی رسم الخط، منی ایچر پینٹنگز اور مغل فن تعمیر شمزا کے فن کی بنیادی جزیات ہیں۔ وہ حروف کو بطور فورم استعمال کرتے ہیں۔ فورمز کی ترتیب اور پھیلاؤ اور جز پر فن کار مکمل طور پر قادر نظر آتا ہے۔ مغل آرکیٹیکچر کے گنبد، مینار اور محرابوں کے خطوط کی گولائیاں، دائروں اور نیم دائروں کی صورت میں، تاریخی پس منظر اور قدیم ثقافت کو شمزا نے منفرد وضع دی ہے۔

شمزا دیار غیر میں قیام کے اولین دور میں بہت مضطرب اور متذبذب رہتے تھے۔ پھر اجنبی ماحول میں شمزا کو اپنا آپ مل گیا۔ انہیں یہ راہ دکھائی دی کہ روایت اور جدت کی آمیزش سے اپنی پہچان برقرار رکھتے ہوئے عصری مصوری میں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔ تنوع شمزا کے اسلوب کی خاصیت ہے مگر ان کے فن کی مرکزیت کہیں منتشر نہیں ہوتی۔ وہ اختصار سے کام لیں یا تفصیلات میں جائیں ان کے انداز کی ہمہ گیری برقرار رہتی ہے۔

اساسیت (Roots) کے موضوع پر بنائی گئی تصویروں میں شمزا ہر بار نئے انداز میں نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ان کا مزاج

ایک ہے مگر تاثر جداگانہ ہے۔ وہ کینوس کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ زیر زمین پھیلنے والی جڑیں گہرے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی ڈلیاں کھردری ہیں۔ جبکہ سطح زمین کے اوپر ابھار سے چھوٹنے والی ٹہنیاں ہوا کے جھونکوں سے لہلہاتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور کہیں متوازی نچیوں میں بل کھاتے خطوط کا ایک سلسلہ آ رہا ہے۔ ایسے سپارے کا ورق ——— اور کہیں عمرا کی، دوما لوی غزل، رنگ و نقش کا ساز سنگیت چھیڑتی ہے۔

نئے سال کی شام، ملک بھر میں آج تعطیل ہے۔ کیوں بھئی۔ کیا ہوا۔ ایک روز قبل ضیاالحق نے مارشل لا ختم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ 73ء کا آئین بحال ہو گیا تھا۔ فوجی آمر نے محمد خان جونیجو کو وزیر اعظم بنا دیا۔ اور اپنی حیثیت بطور صدر مملکت برقرار رکھی۔

مگر ——— یہ لوگ جو اس چھت کے نیچے جمع ہیں ان کے چہروں پہ بے یقینی لکھی ہے۔ ارے بابا، کچھ تو کہو۔ یہ کچھ کہتے ہی نہیں۔ یہی وہ لوگ تھے جو اس روز بھی اکٹھے تھے۔ جب بھٹو کو پھانسی ہوئی تھی۔ غمزدہ تھے۔ دکھی تھے لیکن گزشتہ 7-8 برسوں میں یہ اپنا ردعمل ظاہر کرنے کا ڈھنگ بھول گئے۔ وہ بے حس اور خالی خالی نظر آتے ہیں۔

مغنی آج بھی، گزشتہ کئی برسوں کی طرح شاہراہ فیصل سے گزری تھی۔ اپنے دوستوں سے ملاقات اور نئے ایڈیشن دکھانے کے لیے۔ گزشتہ برسوں میں شہر کی اس بڑی سڑک کے کنارے انسانی کھوپڑیاں لگی ہوتی تھیں جن کی پاسبانی چند باریش حضرات کرتے تھے۔ یہ وارننگ ہوتی کہ خبردار کوئی خوشی نہ منائے خبردار موسیقی کی دھن پر جھومنے نہ لگنا۔

مگر اب کے تو کوئی سپاہی نظر نہیں آ رہا۔ گھروں کے سامنے گاڑیوں کے ٹھٹ لگے تھے۔ ٹریفک جام ہو گیا تھا۔ ہالی ڈے ان کے سامنے ایک شخص کم کا ٹھری کی پرانی دھن بجاتے ہوئے اپنے اکارڈین کے ساتھ جھومنے لگا تھا۔

ان تمام برسوں کے دوران کہیں سے کوئی سریلی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ صرف ہدایات ملتی تھیں۔ چادر اور چاردیواری کی حرمت بچاؤ۔ وی سی آر پر پابندی لگا دی گئی تھی کہ لوگ اس پر فحش فلمیں دیکھتے ہیں۔ جو اخلاق پر برا اثر ڈالتی ہیں۔ پھر پی ٹی وی یکایک پاکستانی فلمیں دکھانے لگا۔ چلو کچھ تو ہوا لیکن وہ فلمیں اسی طرح اچانک بند کر دی گئیں۔ وزیر اطلاعات پریس کانفرنس کے بعد صحافیوں سے بات چیت کر رہے تھے۔

"سر ایک سوال ہے۔" مغنی نے کہا۔

"جی جی۔"

"وہ آپ نے پی ٹی وی پر فلمیں کیوں بند کر دیں؟"

"چھوڑیں جی، آپ کہاں قلموں کی بات لے بیٹھی ہیں۔"

بوتل کا ڈھکنا کس کر بند کر دیا گیا تھا۔

مگر اب رات گئے سڑکوں پر اتنا ہنگامہ، گاڑیوں کی چندھیا دینے والی روشنیاں، کراچی جمخانہ کے سامنے رقص کرتے ہوئے بلکہ فضا میں خالی بوتلیں اچھالتے ہوئے نوجوان۔

بوتل کا ڈھکنا برسوں تک بند رہے تو اس میں گیس بھر جاتی ہے۔ زہریلی گیس۔ اس کے پیچ کو ذرا سا ہلایا تو اس کا کارک جھٹکے سے اڑ گیا۔

عمی نے گاڑی روکی۔ ہائی ڈے ان کے سامنے کھڑی جیپ میں بیٹھے ہوئے پولیس کانسٹیبل سے پوچھا۔ "یہاں کوئی ہنگامہ ہوا ہے کیا۔"

"نہیں جی ہنگامہ تو کوئی نہیں ہوا۔ 12 بجے کے بعد لڑکے خوشی سے نعرے لگا رہے تھے۔"

"کیا نعرے لگا رہے تھے۔"

"وہی کہہ رہے تھے پاکستان زندہ باد۔"

دیوار پر لگی ہوئی احمد پرویز کی تصویر۔ جس پر 1979ء کا سال درج ہے۔ کھڑکی بند ہے۔ لیکن وہاں خوش امیدی بھی ہے۔ فضا کی گھٹن ختم ہونے کی آس۔

رنگوں کی بہار سجانے والا مصور جا چکا تھا۔

اس روز وہ آرٹس کونسل میں عمی سے ملا۔

"کیسی طبیعت ہے؟"

"وہ یہ ہوا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور میں اینٹی بائیوٹکس کھا رہا تھا۔ اس پر میں نے وہسکی پی لی اور الٹی ہو گئی۔ میں اب ٹھیک ہوں۔"

آرٹس کونسل کی پہلی منزل کے ہال میں احمد پرویز کی تصویروں کی نمائش ہو رہی تھی۔ وہیں عمی کی کتاب کی لانچنگ تھی۔ احمد پرویز تقریب کے بعد عمی کے پاس آئے اور کہا۔

"مجھے اپنی کتاب دو۔"

عمی نے لاڈ اٹھا کر کہا۔ "کیوں دوں۔ کیا آپ نے کبھی مجھے اپنی تصویر دی ہے۔"

اگلے روز جمی اپنے دفتر آئی تو اس کی میز پر اخبار کے ورق میں لپٹا ہوا ایک رول پڑا تھا۔ وہ احمد پرویز کی پینٹنگ تھی جو انہوں نے کسی کے ہاتھ بھجوائی تھی۔

تنگ نظر آمر کے دور میں ثقافتی سرگرمیاں ختم کر دی گئی تھیں۔ اظہار میں جہاں کہیں بے باکی کا عنصر شامل ہو جاتا تو اسے فحاشی اور اسلامی روایات کے منافی قرار دے کر سزا اور تعزیر دیا جاتا۔ بہت سے مصوروں نے حالات سے سمجھوتہ کرنے کی غرض سے اور حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی روش تبدیل کر لی تھی اور کچھ ایسے بھی تھے جو احتجاج کرتے تھے۔ مسعود کوہاری کے ذیروکس مکعب میں برقع پوش عورتوں کی تکرار تھی۔ مشکور رضا کے اڑتے ہوئے گھوڑے خطاطی کے حروف میں سمٹ آئے تھے۔ سلیمہ ہاشمی کے زندان کی کھڑکی کے باہر خوش رنگ موسم نے امید دلائی تھی کہ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں سے تازہ ہوا کے جھونکے بند کواڑوں کو کھولیں گے۔

تکنیکی جدت طرازی نے ہمیشہ متضاد آرا کو جنم دیا ہے۔ کچھ لوگ اسے محض تجسس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جبکہ روایت پرست اسے تساہل، بے حسی اور فنکارانہ خیانت قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس تبدیلی کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھنے والے نئی تکنیک کو ارتقا اور عصری تقاضا قرار دیتے ہیں۔

مسعود کوہاری میز پر فاسٹل رنگ بکھیرے۔ ایک خاکے میں رنگ بھر رہے تھے۔ یہ خاکہ ذیروکس مشین پر بنا تھا۔

''مشین نے کیا آپ کا کام آسان کر دیا؟''

''کام تو مجھے ہی کرنا ہے۔ مشین سے خاکہ کشی کرنے سے وقت کی بچت ہوتی ہے۔ لیکن عناصر کی جمع تفریق، تسہیل، اضافہ، سائز کو چھوٹا بڑا کرنا، ایک امیج کو دوسرے پر غالب کرنا یا ہلکا گہرا کرنے کا عمل، حسب ضرورت اسے رد کر دینا یا تسلیم کر دینا۔ یہ میرا کام ہے۔ میرا اپنا فیصلہ ہے جس کے لیے میں مشین سے تعاون حاصل کرتا ہوں۔

شاکر علی نے مسعود سے کہا تھا یہ ضروری ہے کہ تمہارے بنیادی نقوش کا تعلق اپنے خطۂ زمین سے ہو۔ اس پر انہوں نے تلاش شروع کی تو قدیم اور کلیسائی ظروف سے متاثر ہوئے اور سرامکس پر کام کرنے لگے۔ فرانس سے سرامکس کے شعبے میں چار سالہ کورس کیا۔ ڈرائنگ کوہاری کے فن کی اساس ہے۔ وہ مٹی کے ظروف یا ٹائلوں پر نقش نگاری کریں یا کینوس پر، انسانی اور حیوانی جسم کے خدوخال، ان کے اجزائے ترکیبی اور ترتیب و تنظیم کا تنوع منفرد شے پیدا کرتا ہے۔ انسانی جسم حرکت میں آئے تو اقلیدسی اشکال بن جاتی ہیں۔ کوہاری کے بقول گھوڑا طاقت اور دوستی کی علامت ہے۔ اس کی وضع قطع انسانی جسم سے مشابہ ہے۔ بندھے ہوئے

گھوڑے اور آزاد گھوڑے میں بہت فرق ہے۔ گھوڑے کو نکیل سے آزاد کر دیں تو اس کی ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ بہت خوب صورت دکھائی دیتا ہے۔ زیروکس سے بنائی گئیں برقع پوش عورتوں کو کوہری نے "3 گریسز" کا نام دیا۔ محبت، دولت اور جنگ کی دیویاں، جو یونانی کہانیوں میں ملتی ہیں۔ یہ دیویاں ہر دور، ہر زمانے میں فن کاروں کی توجہ کا مرکز بنیں۔ نشاۃ ثانیہ کے دوران اور قرون وسطیٰ میں انہیں بار بار بنایا گیا۔ اب یہاں ان کی صورت برقعے میں چھپ گئی ہے۔

نرسری مارکیٹ کے سامنے شاہراہ فیصل کی سائیڈ لین پر چلتے چلتے وہ بائیں ہاتھ کی طرف مڑ گیا تھا اور کچھ قدم کے فاصلے پر گیلری کے کھلے گیٹ کے اندر داخل ہوا۔ وہ بھی۔ بہت سے دیگر نوجوان فن کاروں کی طرح جو اس سمت میں چلتے ہوئے ایک پلیٹ فارم پر پہنچ جاتے تھے۔ اس رسائی نے ان میں اظہار کا حوصلہ دیا تھا۔ اپنی پہچان بنانے کا وسیلہ مہیا کیا تھا۔ اس دور میں ملک فن و ثقافت کا صحرا بنتا جا رہا تھا۔ لیکن ان سب نے گیلری کو رنگ و نقش کے روپ میں حسن بخشا تھا۔ رومانیت کا تنزل، احتجاج میں سچائی کا اظہار، کبھی شعور اور لاشعور کی آمیزش تو کبھی خواہش اور حقیقت کا تصادم۔ بہت سی جہتیں۔ اپنا اپنا اسلوب، اظہار کا تنوع۔

نسائی بھولا بھالا چہرہ منصور راہی کی تصویروں کا بنیادی جزو تھا۔ وہ برسوں تک اسے بار بار بناتے رہے۔

"جب تصویر نہیں بناتے تو کیا کرتے ہیں۔"

"ریڈیو سنتا رہتا ہوں۔" کم گو اپنے آپ میں گم رہنے والے منصور راہی کی دنیا بہت محدود تھی۔ لیکن جب بیرونی دنیا سے کوئی رشتہ قائم ہوا تو مشاہدے نے ان کے فن کو نئے عناصر کی شمولیت کی ترغیب دی۔

گیلری کی دیواروں پر منصور راہی کی تصاویر گواہی دیتی ہیں کہ سیدھے سپاٹ چہروں نے حرکت کی ہے۔ وہ زندگی کے قریب ہیں۔ لیکن منصور کے اس تغیر میں محتاط رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ حقیقت نگاری کی تسہیل اور نیم تکعیبی نقوش نے تصویر کے مجموعی تاثر کو تازگی دی تھی۔ نسائی چہروں پر روایت پسند تاثر پیدا کرنے والا مصور اس وقت کھل کر سامنے آتا ہے جب اسے کوتوال کا ڈر نہیں ہوتا۔ جب وہ کسی تہمت کے ملنے سے محفوظ محسوس کرتا۔ وہ جسموں کے ملاپ کے خطوط غیر واضح، سیاہ گہرے اور نیلے رنگوں کا امتزاج۔ سب رنگ ایک دوسرے میں گھلتے ہوئے سایہ اور روشنی کی دھندلاہٹ، جذبات کی وارفتگی، برش میں روانی آئی اور سطح پر ریشمی جھریوں کے گداز نے نمو پائی۔

ارے بھئی احسن، عقیل۔ تم لوگ کہاں ہو۔ یہ ٹیلی فون بار بار بج رہا ہے۔

"لو میں نے دو تین بار اٹھایا ہے مگر آگے سے کوئی بولتا ہی نہیں۔" عظمیٰ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب تم فون نہ اٹھانا۔ میں خود ہی دیکھتا ہوں۔"

امام کے چہرے پر تشویش تھی۔ پھر وہ خود ہی یہ سوچ کر قدرے مطمئن ہو گئے کہ اس طرح کی کریک کالز غیر معمولی نہیں ہیں۔

مشکور کی تصاویر کی نمائش ہونے والی تھی۔ کچھ تصویریں فریمر کے پاس تھیں۔ گیلری کا فوٹوگرافر واحد سورج کی روشنی میں تصویریں کھینچنے کے لیے انہیں باہر لے آیا تھا۔ امام ہدایات دینے لگے کہ ایسی تصویریں منتخب کرے کہ بروشر جچ کا لگے۔

"دیکھو ان دونوں تصویروں کے رنگ ایک جیسے ہیں۔ زرد و نارنجی۔ ہاں وہ لے لو۔ اس میں نیلا رنگ نمایاں ہے۔ اس طرح تصویریں ایک دوسرے کو اوورلیپ نہیں کریں گی۔"

"لو پھر فون بج رہا ہے۔ اٹھاؤں۔" عظمیٰ نے برآمدے میں آ کر آواز دی۔

"نہیں تم نہیں اٹھانا۔ میں دیکھتا ہوں۔"

"جی کون صاحب بول رہے ہیں۔"

"کوئی بھی نہیں۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا۔ آپ نے کس لیے فون کیا ہے۔" امام جھنجھلائے۔

"میں نے آپ کو وارننگ دینے کے لیے فون کیا ہے۔"

"کس بات کی وارننگ۔"

"آپ نے جو فحاشی کا اڈہ کھول رکھا ہے اسے بند کریں۔"

"جی، آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔ کون سا اڈہ۔"

"یہی، جہاں ننگی تصویریں سجائی جاتی ہیں۔"

"کیا ننگی تصویریں! کونسی!"

"میں نے خود دیکھی ہیں، پھر جو آپ کی گیلری میں جس قسم کے لوگ آتے ہیں۔ مجھے یہ بھی پتہ ہے۔ کافر ہیں وہ سب۔"

امام صبر سے سن رہے تھے۔

"اور سنیں، اگر آپ نے یہ سب کچھ بند نہ کیا تو اچھا نہیں ہوگا۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ کے بچے کون کون سے اسکولوں

میں پڑھتے ہیں۔" اور ٹیلی فون بند کر دیا۔

علی امام نے میز پر رکھی ہوئی پائپ اٹھائی۔ اس کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑی، تمباکو ڈال کر اسے جلایا اور منہ میں دبا کر باہر آئے۔ فریم ساز سے پوچھا کہ "کتنی تصویریں تیار ہیں۔"

"جی بس دو چار رہ گئی ہیں۔ باقی سب تیار ہیں۔"

"ہاں۔ واحد میاں، ایک دو روز میں پرنٹ لے آنا۔ بہرحال چھپنے میں کم از کم دو ہفتے لگ جاتے ہیں۔"

"جی میں پرسوں اسی وقت آؤں گا۔"

فلیٹ میں اندر گئے۔ "شانو کل تم احسن اور عظمیٰ کے اسکول جانا۔"

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، گھبرانے کی بات نہیں۔ تم ان کے پرنسپل کو تاکید کر دینا کہ جب تک ہم دونوں میں سے کوئی بچوں کو لینے نہ آئے، انہیں جانے نہ دیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ میں چلی جاؤں گی، لیکن بات کیا ہے۔"

"بتاؤں گا۔ پہلے ایک کپ چائے لے کر آؤ۔ وہ کچھ دیر پہلے منظور رضا کی تصاویر کے بارے میں تعارفی نوٹ لکھ رہے تھے۔ اس کا آخری جملہ ادھورا تھا اسے مکمل کیا۔

"منظور رضا 70-80 کی دہائی میں منظر عام پر آنے والی نئی کھیپ میں سب سے زیادہ معروف، تیز رو اور کل وقتی فن کار تھا۔ اس کی اولین تصویروں کو دیکھ کر یہ قیاس آرائی مشکل نہ تھی کہ یہ نوجوان مصور یہاں موجود رہنے کے لیے آیا ہے۔ وہ اپنے دور کا نمائندہ اور یکسر مختلف مصور کے طور سامنے آیا تھا۔"

"منظور نے کینوس پر روغنی رنگوں کے ساتھ بہت سی تصویریں بنائیں لیکن کینوس کی کھردری سطح ان کی نفاست پسندی کا ساتھ نہ دے سکی تو وہ کاغذ پر پینٹ کرنے لگے۔ رنگ و نقش میں تنوع پیدا ہوا۔ سفید سطح کے بالمقابل ہلکے، گہرے رنگوں کو عمودی اور متوازی پٹیاں بنانے کے علاوہ موٹو پینٹ کی تکنیک سے چھوٹے بڑے ٹکیوں کی وساطت سے ٹیکسچر پیدا کیا۔ رنگین سطح پر نسائی پیکر اس طرح تراشے کہ جیسے مجسمہ ساز لکڑی یا پتھر سے پیکر سازی کرتا ہے۔ وہاں گرد و پیش اور جسم کے درمیان کوئی لکیر نہیں ہے۔ بعض تصویروں میں جسم کے بالائی حصے میں حرکت جو لطافت اور نفاست پیدا کرتا ہے، جس سے آئینے کے

دودھیا عکس کا تاثر قائم ہوا اور آس پاس کے رنگ مزید روشن ہو گئے۔ اس کے جسم کے خدوخال میں اشتعال انگیزی کے بجائے رومانیت کی ملاحت پیدا ہوئی۔

مظلوم قلیل عرصے میں بیسٹ سیلر بن گیا تھا۔ اس لیے کہ اس کی تصاویر خوش رنگ اور خوش وضع ہوتیں۔ اس لیے بھی کہ ان کے نرخ متوسط طبقے کے خریداروں کی استطاعت سے مطابقت رکھتے تھے۔ برسوں کی ریاضت سے مظلوم میں بھرپور اعتماد پیدا ہوا۔ ان کے اسٹروکس میں بہاؤ آ گیا تھا۔ آزادی تھی لیکن بے ضابطگی نہ تھی۔ گھوڑے کی تجسیم سے ملمول کی فطری تیز روی اور لپک سے آرٹسٹ کے اسٹروکس میں رابطہ قائم ہوا اور تاثر میں بالیدگی پیدا ہوئی۔

"ہیلو انگری ینگ مین" مینی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

سلو نے چہرے پر متانت اور گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے اسے آرتا گوری نا خطاب کو دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دیے۔

نا گوری بہت دنوں بعد منظر پر آئے تھے۔ وہ گیلری میں اپنی حالیہ تصویروں میں گھرے بیٹھے تھے۔

"آپ اتنے دنوں کہاں رہے؟"

خبر گرم تھی نا گوری کی تصویروں میں ایسا مواد تھا کہ اس سے ہمارے چند دوست ملکوں سے تعلقات خراب ہو سکتے تھے۔ سرکاری ترجمان۔ گیلری میں آویزاں تصویروں کو وزارت ثقافت نے رد کر دیا تھا۔ ضیاء الحق کا زمانہ تھا۔ کھری بات سننے کا حوصلہ کسی کے پاس نہیں تھا۔ کوئی اپنے اندر جھانکنا نہیں چاہتا تھا۔ کوئی حاکم وقت کو ناراض کرنے اور اس کے زیر عتاب آنے کا خدشہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

نا گوری کا احساس زخمی تھا۔ وہ بیروت کی تباہ کاریاں ہوں۔ نواب پور میں عورت کی بے حرمتی ہو۔ پاکپتن کے قریب اندھی لڑکی کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ۔ وہ لڑکی جو اپنے مالک کی ہوس کا شکار ہوئی تھی لیکن حدود آرڈیننس کے تحت اس کی آدھی گواہی ناکافی تھی اس لیے وہ مجرم ٹھہری۔ تصویر کا عنوان تھا۔ "قربانی کا گوشت" فن کار نے وہ منظر دیکھا تھا جب پشاور کے ایک افغان کیمپ میں بیرون ملک سے آیا ہوا گوشت تقسیم کیا جا رہا تھا۔ منجمد گوشت کے درآمد شدہ ڈبوں سے ان غریبوں اور بے گھر لوگوں کے مصائب کہاں تک ختم ہوں گے۔ یہ جیتے جاگتے لوگ تو خود قربانی کا گوشت ہیں۔ سامراجیت کا شکار ہیں۔ حکومت کہتی ہے برآمدات کو فروغ دینے سے زرمبادلہ کمائیں گے اور ملک امیر ہو جائے گا۔ نا گوری کی ایک تصویر۔ ثقافت، برآمدات، غریب عورتیں پرانے چیتھڑوں کی کترنیں جوڑ کر اپنی ننگ کو ڈھانپتی ہیں۔ بھوکا بچہ ننگی زمین پر اوندھے منہ لیٹا ہے۔ جسم پر اتنے کپڑے بھی نہیں کہ اس کا سر تا پا ڈھک سکے۔

تصویر کے نہ بکے۔ ناگوری کو اس کی پروا نہیں تھی۔ کوئی گیلری نمائش نہیں دیتی۔ نہ دے۔ وہ انہیں کسی سڑک کے کنارے لٹکا دیں گے۔ وہ جاگیرداروں کے مظالم، حکمرانوں کے منافقانہ رویوں کے خلاف احتجاج ضرور کریں گے۔

ناگوری کے اندرون کا دکھ ان کی تصویر کے معانی اور جمالیات پر غالب نہیں آتا۔ چند رنگوں اور خط و نقش سے بھرپور تاثر پیدا کرنا ناگوری کا کمال ہے۔ نقوش کی تشکیل کے علاوہ ناگوری کی تصاویر میں سطح کی تقسیم اہم ہے۔ ان کے ہاں کوئی رنگ پھیلتا ہوا دوسرے رنگ میں مدغم نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی جگہ اور پہلے سے متعین کی گئی حدود کے اندر رہتا ہے۔ وہاں بہاؤ نہیں، ٹھہراؤ ہے۔ روانی نہیں استحکام ہے۔ البتہ دوسرا رنگ اپنے مختلف مزاج کے باوجود اس سے ہم آہنگ ہے۔ اگر کسی ایک تصویر میں تیز زرد یا نارنجی رنگ نمایاں ہے تو وہاں نرم نیلا رنگ توازن قائم کرنے کے لیے موجود ہے۔

رات خاصی گزر چکی تھی۔ بی ایم نے گلاس سے آخری گھونٹ حلق میں اتر لیا۔ "اچھا میں اب چلتا ہوں۔"

شہناز نے دوسرے کمرے سے بی ایم کی آواز سنی تو چلائی "ارے کھانا کھا کر جائیں۔ کھانا تیار ہے۔ بس پانچ منٹ میں گرم ہو جائے گا۔"

"نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"وہ تمہاری مرضی۔" علی امام نے بی ایم سے کہا۔ "لیکن آج تم نے بہت پی لی ہے۔ تم گاڑی نہیں چلا سکتے۔ میں تمہیں چھوڑ کر آتا ہوں۔"

"نہیں نہیں۔ میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ خود ہی چلا جاؤں گا۔" بی ایم بضد تھا۔ میزبان مجبور ہو گئے۔ بی ایم نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ ایکسی لیٹر دبایا۔ امام اور شہناز ابھی برآمدے تک ہی پہنچے تھے کہ زور سے دھماکے کی آواز آئی۔ بی ایم نے اپنی گاڑی گلی کے کونے پر کھمبے میں دے ماری تھی۔

وہ ایسے ہی کرتا تھا۔ کسی کی نہیں سنتا تھا۔ ایک بے قاعدہ زندگی گزارنے والا لاابالی شخص بی ایم (بشیر مرزا) تنہا آدمی تھا۔ محبت کا متلاشی۔ کبھی کبھار اس کے اردگرد اتنی ویرانی ہوتی کہ وہ اس میں ڈوب جاتا تھا۔

وہ ایک حساس فن کار ہے۔ اپنے گرد و پیش سے باخبر رہتا ہے۔ وہ کہیں بھی گیا۔ کسی کی بھی رفاقت میں رہا۔ اس کی تنہا لڑکی ہمیشہ اس کے ساتھ رہی۔ وہ جو اس کے تصویری سلسلوں کا اہم جز وتھی۔ کسی نہ کسی روپ میں، کسی نہ کسی انداز میں۔ وہ کبھی پھولوں کے جلو میں دکھائی دیتی اور کبھی پھول اس کی دل آویزی میں اضافہ کرتے۔ اس دوران خط و نقش ایک دوسرے میں تحلیل نہیں ہوتے تھے بلکہ ایک دوسرے کی حد مقرر کرتے۔ خط شکل کو واضح کرتا۔ ہر رنگ اپنی جگہ مستحکم دکھائی دیتا۔ بندھ ساتی تقسیم کی

مانند۔ "تنہائی کی سحر اور چاند" بی ایم کی سیریز کا شاہکار۔ بی ایم ضیا کی آمریت کے اختتام پر ساری قوم کی طرح بہت جذباتی تھا۔ وہ "پاکستان کے عوام" کی سیریز میں جت گیا۔ جس میں فیض، جالب اور فراز جیسی نامور ہستیوں کے علاوہ عام زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی تھے۔ لیکن جب آنکھوں پر اوس گرنے لگی تو بی ایم امپریشنزم کی طرف پلٹ گیا۔ جن میں نسائی چہرے کے خدوخال کمپوزیشن کا اہم نقش تھے۔ ان تصویروں میں رنگ تغزل اور تزئینی عناصر نمایاں تھے۔ بی ایم کا یہ کام تکلیف دہ حقائق سے فرار کا بہانہ تھا۔ مگر وہ ان سے زیادہ دیر تک لاتعلق نہ رہ سکا۔ بی ایم کی تصویروں میں انسان کشی اور معاشرتی سیاہ کاریوں کے خلاف احتجاج اٹھا۔ وہ جو انسانی چہروں کو پھول پتیوں اور ستاروں سے سجاتا تھا۔ وہ چہرے جغرافیائی مظالم میں مسخ ہو گئے تھے۔ انسانی وجود کے اعضا بکھر گئے تھے۔ بی ایم نے سندھ میں قیام کے دوران لینڈ اسکیپنگ کی۔ اجنبی شہر میں اکیلا مصور، سامنے کے منظر اور اندر کے منظر میں تکرار ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو جھٹلاتے ہیں لیکن ایک دوسرے کی رفاقت میں ہیں۔ نیلے، سرخ، سفید رنگوں کے اسٹروکس کہیں کہیں منظر میں موجود اشکال کو تحلیل کرتے ہیں تو کبھی بندرگاہ کی روشنیاں تصویر کی جمالیات میں اضافہ کرتی ہیں۔

اس روز عینی پریس کلب جانے کے لیے گھر سے نکلی۔ وہ دھوراجی کے فلیٹوں کے قریب دکانوں اور ریڑھیوں سے خریداری کرنے والوں کے رش سے گزرتی ہوئی آگے بڑھی۔ الٹے ہاتھ پر رنگوں والا کمیونٹی سینٹر پر نظر پڑی تو رفعت علوی کا خیال آیا جو اس عمارت میں واقع وی ایم گیلری کی سرپرست ہیں۔ رفعت ان دنوں گیلری کے انتظامات اور مصروفیت کے بعد تصویر بنانے لگتی ہیں تو بقول ان کے "میری روح ہوا اور خوشبو کے ساتھ بلندی کی طرف اڑنے لگتی ہے۔ بستی کے اندھیرے سمندروں سے دور۔ وہ اس ماورائی استغراق میں جو کچھ بناتی ہیں اس پر خواب آلود دھند کا چھا جاتا ہے۔ ان کے ہاں صوفیانہ پن ہے۔ اسراریت ہے۔ ہوا کے موضوع پر تصویریں بنائیں۔ ہوا کے نرم و نازک جھونکے کینوس کی سطح کو چھو کر اوپر اٹھے۔ جیسے اماوس کی رات میں کسی منڈیر پر رکھا ہوا دیا بجھ جائے تو دھوئیں کے مرغولے کچھ دیر کو اپنے آپ سے الجھتے ہیں، پھر لہراتے ہوئے فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ رفعت خوش امید ہیں۔ پہلی بارش کے بعد تھر کے چٹیل صحرا میں کھلنے والے کیکٹس کے پھولوں سے احساس اور اظہار کی رنگ آمیزی میں توازن پیدا ہوا۔ رفعت نے قریہ قریہ ملکوں ملکوں سفر کے دوران زمین کے رنگ اٹھائے اور اپنی پینٹنگز میں بطور میڈیم استعمال کیا۔ ہمارے شہر کو جنم دینے والی دھرتی ماں کو خراج عقیدت و احترام کا استعارہ۔

انڈس گیلری کا بیرونی گیٹ ہمیشہ کھلا رہتا تھا کہ کوئی فن کار یا خریدار آنا چاہے تو رکاوٹ نہ ہو۔ علی امام ناشتے کے بعد افریقی ماسک، جو انہوں نے حال ہی میں خریدا تھا، پرکھنے لگے تھے کہ بعض اوقات پہلی نظر میں ان کی اصلیت کے بارے میں معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انٹیکس کا کاروبار کرنے والے اکثر دھوکا دے جاتے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ کوئی اسے کلکٹر کو دکھائیں وہ تسلی کرنا چاہتے تھے کہ اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔

معاً گیلری کے ہال میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ایک اجنبی شخص ہال کے درمیان کھڑا تھا۔ دوسرا دروازہ کھول کر برآمدے میں رکا ہوا تھا۔

"جی، میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔" امام نے اسٹوڈیو کے دروازے سے جھانکا۔

"کیا آپ بیچ سکتے ہیں۔" پیشتر اس کے کہ وہ فرش پر دوسرا پاؤں رکھتے نووارد نے پستول نکالا۔

"کیا مطلب ہے، کون ہیں آپ۔"

"یہ سب بعد میں بتاؤں گا۔ میرے آگے آگے چلیں۔ آواز اٹھانے کی کوشش نہ کریں۔" ٹنکی نے ابو کو یرغمالی حالت میں دیکھا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ "خاموش الماری کی چابیاں کہاں ہیں۔"

لٹیرے تھے وہ۔ گھر میں جو کچھ تھا لے گئے۔ دیواروں پر لگی ہوئی تصویریں ان کے کام کی نہیں تھیں۔ پچھلی نمائش میں بکنے والی تصویروں کی آمدنی انہی کے حصے میں آئی تھی۔

"امام صوفے پر نیم دراز ہو گئے۔ شہناز کے چہرے پر پریشانی کی گھٹا چھائی تھی۔ بڑھ کر پانی کا گلاس لائی۔ "لیجیے پانی پی لیں۔"

"ارے شنو، فکر نہ کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ٹنکی کہاں ہے اور دیکھو تم چائے کے لیے پانی چڑھا دو۔"

"یہ تو ہونا تھا۔" سوچ رہے تھے۔ "بہت دن سے دھمکیاں مل رہی تھیں۔ مال تو انہیں اس سے زیادہ کہیں اور بھی مل جاتا۔ لیکن وہ گیلری بند کروانے آئے تھے۔ خیر ---" امام نے پائپ کے دو تین کش لگائے۔ تمباکو کی مہک دیواروں پر آویزاں تصویروں کے ساتھ لپٹ رہی تھی۔

افغانستان میں بدامنی ہوئی تو پشاور کا بازار اجڑ گیا۔ اس کے کاروباری اپنا مال اٹھا کر دوسرے شہروں کی طرف چل پڑے۔ ان میں سے بعض نے سپر ہائی وے کے کنارے کی بستی سہراب گوٹھ میں دکانیں سجا لیں۔ رنگ برنگے ریشمی کپڑوں کے تھان، چینی کے برتن، الیکٹرونکس۔ شہر کی عورتوں کے مزے آ گئے۔ اب انہیں کراچی سے پشاور تک کا سفر نہیں کرنا پڑتا تھا۔

سیراب گوشوں کی دھوپ سے اٹی کھلی جگہوں پر لمبی لمبی کاریں کھڑی دکھائی دیتیں۔ پھر کراچی لسانی فسادات سے دہلا اٹھا اور ایک روز ریشمی کپڑوں کی اس مارکیٹ میں شعلے بھڑک اٹھے۔ جو کاری کا دھواں آسمان کی نیلاہٹوں کو آلودہ کر رہا تھا۔ نور جہاں بلگرامی نے ملبے سے کپڑوں کی دھجیاں پلاسٹک اور کاغذ کے ٹکڑے چن لئے۔

نور جہاں بلگرامی کا نام بطور آرٹسٹ جانا پہچانا تھا۔ ان کا فن ٹیکسٹائل اور جیولری ڈیزائننگ میں نمایاں تھا۔ وہ ایک تصویری منظر پر آئیں تو یہ ایک چونکا دینے والی خبر تھی۔

جارج براک نے شاہ بلوط کے دانے دار وال پیپر کے تراشے اپنی چار کول ڈرائنگز پر چپکائی تھیں۔ پکاسو نے روغنی کپڑے کی کترنوں اور رسی سے اپنی تصویروں میں کولاژ کی جدت طرازی کی تھی۔ جبکہ نور جہاں نے شدت پسندی کی انتہاؤں سے اپنے دکھ کا اظہار کیا تھا۔ نور جہاں کی ان تصویروں کے نقوش میں ایک تھی۔ وہاں کرب تھا۔ فریاد تھی کہ یہاں گرد، مٹی کے گدلے رنگ، بھورے اور زرد۔ لیکن وہاں یاسیت کی گمبھیر تاریکی نہیں بلکہ امید کی روشنی تھی۔ جہاں جہاں یہ کرنیں پھوٹتی ہیں تو تاریکی کی چادر پھٹنے لگتی ہے اور وہ کہیں چھپ جاتی ہے۔ نور جہاں کی تصویر کے سرخ رنگ سلگ اور زندگی کے اڑائے ہوئے معصومیت کے خون کے چھینٹے ہیں۔ ملبے کے ڈھیر سے اٹھائے ہوئے کپڑوں اور کاغذ کے ٹکڑوں سے ذات اور سطوت کے کولاژ سے ٹیکسچر پیدا ہوا۔ مکھی اشکال میں انسانی چہروں اور پھول پتیوں کے شائبے ہیں۔ تکلیف دہ حقائق کے ہجوم میں انسانی تعلق کے نرم و نازک پھریرے۔

ٹیلی فون لائن کی اس طرف سے علی امام کہہ رہے تھے۔ ”ہاں بھئی، تمہیں اقبال جعفری کی نمائش کا دعوت نامہ مل گیا ہوگا۔“

”جی ملا ہے۔“

”اس کی تصویریں لگ چکی ہیں، فوٹو گرافس بھی تیار ہیں۔ تم آج شام میں کسی وقت آکر تصویریں دیکھ لو۔ اقبال سے بات چیت بھی کر لینا۔“

عینی خاموش تھی۔

امام پریشان ہوئے۔ ”کیا میری آواز آ رہی ہے۔“

”جی میں سن رہی ہوں۔“

"کیا ہوا، انشام میں کہیں کھوئی ہو۔"

"جی نہیں، بس مجھے اقبال جعفری کے بارے میں نہیں لکھنا۔ پچھلی بار آرٹس کونسل میں جو ان کی نمائش ہوئی تھی تو اس کے بارے میں لکھا تھا۔ جس پر انہوں نے ایک ناشائستہ خط میرے ایڈیٹر کے نام لکھ دیا۔ اب کے نہ جانے کیا کریں گے۔"

"چھوڑو... وہ مزاجاً ایسا ہے۔ لیکن اس دفعہ اس نے اچھا کام کیا ہے۔ آ کر دیکھو تو سہی۔"

عینی نے حامی بھری۔ وہ علی امام کی بات ٹالنے کی گستاخی نہیں کر سکتی تھی۔

اقبال جعفری ڈاڈاایسٹ ہے۔

ڈاڈاایسٹ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ایسا شخص وہ کچھ کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ جس پر دوسرے تلملانے لگیں۔ اگر وہ خود پر ضبط نہ کر سکے تو مداری معلوم ہونے لگتا ہے۔ وہاں جدت کے بجائے کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔ وہ خود کو تسلیم کروانے کے لیے مچلتا ہے۔ اصرار کرتا ہے کہ مجھے درست مانو۔

اقبال جعفری کی گزشتہ تصویروں نے ناظر کو تذبذب میں ڈالا تھا کہ وہ کس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ ہمارا، آپ کا یا اپنا۔ کس کا؟ اپنی اقدار کا؟ تہذیب و ثقافت کا۔ ایک فن کار جو پیشہ ورانہ طور پر قانون دان ہے۔ لیکن مصوری میں لاقانونیت کا علمبردار ہے۔ ڈاڈاایسٹ کا قانون۔ حیرت زدہ کرنے والا انداز۔

اقبال جعفری کا انداز وہی رہا ہوتا۔ لیکن رنگ و نقش کے ساتھ ان کا برتاؤ ایسا تھا کہ جیسے وہ ان سے دل لگی کرتے ہیں۔ نرم مزاجی نے جمالیاتی تاثر کو ابھارا تھا۔ انہوں نے ان تصویروں کو جمالیاتی تجرید کا نام دیا۔ نام کا اعتبار برقرار رہا۔ وہ دھچکا نہیں دیتیں بلکہ تجسس پیدا کرتی ہیں۔ وہاں عجب تھا۔ یا نثری نظم کی طرح۔ لاتعلق عناصر ایک دوسرے کے قریب ہو کر بھی خود کو اجنبی محسوس کرتے ہیں لیکن ترتیب و توازن انہیں اپنائیت کا احساس دلاتے ہیں۔

اقبال جعفری نے باور کرایا کہ فن کی ہر صنف کو اپنے لیے نئے افق تلاش کرنے ہیں۔ حال کو آگے بڑھنا ہے۔ مستعمل علامتوں کو نئی وضع دے کر ہی جمال و کمال کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ حروف، ہندسے، خطوط اور نقطے، یہ سب نئے نہیں ہیں۔ ان کی مخصوص شکل و صورت سے ہی ان کی پہچان بنتی ہے۔ ان علامتوں کو از سر نو ترتیب دے کر ہی ان کے باہمی رشتے کو برقرار رکھتے ہوئے تنوع اور تازگی پیدا ہوتی ہے۔

امام نے اسٹوڈیو کی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ دروازے کے قریب ڈیک پر رکھا ہوا ٹیلی فون بجنے لگا۔ پلٹے اور ریسیور

اٹھایا۔ آواز آئی۔

"جی میں 70 کلفٹن سے بول رہا ہوں۔ بی بی صاحب آپ کے پاس آنا چاہتی ہیں۔ انہوں نے پوچھا ہے کہ وہ کس وقت آئیں۔"

"گیلری صبح سے رات گئے تک کھلی رہتی ہے۔ وہ جب بھی آنا چاہیں۔ انہیں جو وقت اور دن سوٹ کرتا ہو بتا دیں۔ میں انتظار کروں گا۔"

بے نظیر بھٹو جب سے جلاوطنی کے بعد وطن لوٹی تھیں۔ وہ 70 کلفٹن پر مقیم تھیں۔ اس کے ساتھ انہیں یہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ ان کا گھر نہیں ہے۔ وہی گھر جہاں انہوں نے اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ بچپن کے خوشگوار دن گزارے تھے۔ انہوں نے اپنا گھر بنوانا شروع کر دیا تھا جو اب تقریباً مکمل تھا۔ وہ اقدس گیلری سے گھر کی آرائش کے لیے کچھ تصویریں خریدنا چاہتی تھیں۔

امام اور شہناز بی بی کی آمد کی خبر پر پھولے نہ سماتے تھے۔

اس روز بی بی گیلری کے ہال میں بیٹھی تھیں۔

"میں آپ کے حوصلے کی داد دیتا ہوں۔ آپ نے چھوٹی عمر میں اتنی زیادہ تکلیفیں اٹھائیں۔"

"جی۔ بس جیسے تیسے وہ دن بھی گزر گئے۔ اب میں وطن لوٹ آئی ہوں۔ وہ سب کچھ بھول جائے گا۔"

"میں آپ کے والد کا مداح ہوں۔ ان کے لیے اپنی جان بچانا مشکل نہ تھا۔ لیکن کسی آمر کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے بجائے انہوں نے موت کو ترجیح دی۔ اصول پسند اور بہادر شخص تھا۔" باپ کے بارے میں سن کر بی بی کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

کچھ دیر تک ماضی کے تکلیف دہ دور اور مستقبل کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ بی بی جب بہت رنجیدہ نظر آنے لگیں تو امام نے دھیان بٹانے کے لیے کہا "آیئے وہ تصویریں دیکھ لیں۔"

"ٹھیک ہے میں یہ تصویر لوں گی۔" بی بی نے کہا۔

"مگر میں یہ تصویر آپ کو نہیں بیچوں گا۔" بی بی ٹھٹکیں کیا بھی تو وہ اتنی محبت سے بات کر رہے تھے۔

"آئی ایم سوری۔ آپ کی چوائس اچھی نہیں ہے۔"

بی بی ہنسیں۔

"چلیں، دوسرے کمرے میں کچھ اچھی تصویریں ہیں۔ میں تجویز کروں گا۔ پسند اور فیصلہ آپ کریں گی۔"

بی بی اب ریلیکس تھیں۔ "اتنے سال باہر رہنے کے بعد شاید میرا ٹیسٹ خراب ہو گیا ہے۔ واقعی یہ تصویریں جو آپ نے

دکھائی ہیں میری فہرست چونکہ اُس سے بہت زیادہ اچھی ہیں۔ ٹھیک ہے پروفیسر علی۔"

عظمیٰ بڑی دیر سے ضیاء امام کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ بار بار گھڑی دیکھتی۔ ٹھیک ہے کچھ دیر اور انتظار کر لیتی ہوں۔ اس نے ضیاء امام کی تصویری نمائش کا بروشر پڑھنا شروع کر دیا۔ ان کا تعلق راجستھان سے ہے۔ اب کئی برسوں سے کینیڈا میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ بیک وقت پینٹر، فوٹوگرافر اور ڈیزائنر ہیں۔ باہر سے کچھ قدموں کی آواز سنائی دی۔ نو وارد نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔

"جی میں سمجھ گئی۔ میں آپ ہی کے انتظار میں تھی۔"

ضیاء امام نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میرا آنے کا قطعی موڈ نہیں تھا۔ مگر جب آپ نے کہا کہ آپ کو انٹرویو دینا پڑے گا تو میں مجبور ہو گیا۔ آپ کا جملہ ہی اس قدر زوردار تھا۔"

کچھ دیر پہلے عظمیٰ نے ضیاء امام کی تصویریں دیکھیں تو ایک خوشگوار احساس ہوا تھا۔ ضیاء امام کے رنگ کھلے کھلے ہیں۔ انھوں نے روایت اور جدت کا ملاپ بڑی مہارت اور خوبی سے کیا ہے۔

"میری تصویروں کے رنگ راجستھان سے آئے ہیں۔ وہاں کی موسیقی، وہاں کے مہاراجہ، ان کے محل اور غریب عوام۔ ان کے دکھ اور مسکراتے ہوئے چہرے۔"

"آپ نے پڑھا ہوگا کہ دو روز پہلے آرٹس کونسل میں میرے ساتھ شام منائی گئی تھی۔ میں نے اسٹوڈنٹس کو فوٹوگرافی پر لیکچر دیا تھا۔ اس دوران میری نظر ایک بچی پر پڑی۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ اس نے چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ میں نے کیمرے سے فوکس کیا تو وہ شرمائی۔ کلک۔ میں دم بخود تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں دیکھا تھا۔ اس کی شرماہٹ نے مجھے ایک ماسٹر پیس دیا تھا۔"

ضیاء امام فطرت کے ساتھ رقص کرتے ہیں اور لیزر مشین کے ساتھ فلرٹ کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنی فطری رجائیت پسندی کی بدولت روایتی اور جدید عناصر کو اس ڈرامائی انداز میں ایک دوسرے میں ضم کرتے ہیں کہ دو کائنات یکجان ہو جاتی ہیں۔

"منظر خود بخود بنتے ہیں۔ اس وقت بھی جب میں کچھ پڑھ رہا ہوتا ہوں۔ میں کام کرتے وقت کوئی منصوبہ بندی نہیں کرتا۔ سب کچھ آٹومیٹک ہوتا رہتا ہے۔ اسے آپ کولاژ کہیں یا فوٹو مونتاژ۔ وہاں میری ایک دنیا بن جاتی ہے۔ پہلی بار شاید وہاں کنفیوژن ہو۔ کچھ سمجھ میں نہ آئے لیکن اسے آپ بار بار دیکھیں تو ہر بار نئے معانی نکلیں گے۔"

"یا وہ تکنیک ہے۔ جو آپ کو حیران کرتی ہے اور آپ کی جمالیاتی حس کو تسکین بھی فراہم کرتی ہے۔"

طارق روڈ کا ٹریفک رواں تھا۔ فٹ پاتھوں پر عورتوں اور مردوں کا ایک ریلا بہتا چلا جا رہا تھا۔ ہر کوئی اپنے اپنے کام نمٹانے کی دھن میں تھا۔ "ارے" آواز آئی۔ "وہ دیکھو" اس نے بھی ادھر دیکھا۔ ایک دراز قد مرد گہرے نیلے رنگ کی شلوار قمیص پہنے تھا۔ سر پر چاندی جیسے چمکتے ہوئے بال، چہرے پر بے نیازی، کون ہے یہ۔ معلوم نہیں۔ وہ کوئی فقیر نہیں لگ رہا۔ لیکن ننگے پاؤں ہے۔ اس کے پاؤں میں جوتا نہیں، کون ہے" پتہ نہیں۔

وہ شخص۔ مقبول فدا حسین تھا۔ جسے ہندوستان والے ایم ایف حسین کہتے ہیں۔ حسین پاکستان آئے تو فنون لطیفہ کے حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ انہوں نے لاہور میں ایک ماہ قیام کیا۔ ان پر لاہور کا جادو چل گیا تھا۔ مگر لاہور کے میڈیا کو خبر تک نہ ہوئی کہ وہ شخص کون ہے جو ریلوے اسٹیشن کے کسی بینچ پر گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے۔ وہ وہاں کی معاشرت بول چال، چہرے اور بہت سنتا تو اسے بے شمار چھوٹی چھوٹی جزئیات مل جاتیں اور اس کے ذہن میں کئی پرتو ابھرتے۔ مشاہدہ تخلیقی حیات کو تازہ کر دیتا۔ حسین کو سب کی طرح کراچی بمبئی جیسا اور لاہور دہلی جیسا لگا تھا۔ "لیکن لاہور میں کچھ تھا۔ شہر کی فضا میں کوئی صوفی بیٹھا تھا۔" انہیں سنائی دینے والی آوازیں مانوس لگی تھیں۔

الحمرا گیلری میں ان کی تصاویر کی نمائش ایک اہم واقعہ تھا۔ اس روز صبح اور شام کے تمام اخباروں نے اس خبر کو نمایاں طور پر شائع کیا تھا۔ علی امام کے اسٹوڈیو میں وہ علی سے باتیں کر رہے تھے۔

"لٹریچر اور آرٹ دونوں میں وقت کے ساتھ تبدیلی آتا ناگزیر ہے۔ اسی طرح دنیا بھر کے جدید رجحانات اور اسلوب سے متاثر ہونا بھی لازمی ہے۔ لیکن ہر جگہ پنڈت بیٹھے ہوئے ہیں جو ہر طرح کی جدت کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ یہ ہمارے ہاں کا فن نہیں ہے۔ یہ ڈالس اور میوزک کہیں اور سے آیا ہے۔ ہمارا کلچر تباہ ہو رہا ہے۔ یہ غلط ہے۔ تم وہی کرو جو چاہتے ہو۔ جو تمہارا من کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ تمہاری پہچان از خود بن جائے گی۔ جو عناصر تمہیں ورثے میں ملے ہیں انہی کو لے کر آگے بڑھو۔ انہی میں جدت پیدا کرو۔ وہی تم ہو گے۔ تم آئی سولیشن میں نہیں رہ سکتے۔ تمہیں دنیا کے ساتھ چلنا ہو گا۔"

باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ "پکاسو جب 20 سال کا تھا تو اپنے فن کا ماسٹر تھا اور اسے بچے کی طرح تخلیق کرنے کے لیے 80 سال لگ گئے۔"

ناہید رضا کے ہاں ڈنر تھا۔ ایم ایف حسین کے اعزاز میں۔ بہت لوگ تھے۔ وہ سب مصور، شاعر، ادیب تھے۔ حسین زیادہ بات نہیں کر رہے تھے۔ وہ سب کی باتیں سن رہے تھے۔ انہیں دیکھ رہے تھے۔ لیکن کوئی بھی زیادہ بات نہیں کر رہا تھا۔ سب حسین کو دیکھ رہے تھے۔ برصغیر کے اتنے بڑے فن کار کو اپنے درمیان پا کر سرشار تھے۔ وہاں ان کی رفاقت کے حسین رنگ تھے۔ جو مہمانوں کے چہروں پر بے تھے۔

سلطان مسجد سے اذان فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ حسین کے چہرے پر ملاحت کا گداز تھا۔ وہ ایک شام پہلے کہہ رہے تھے۔ ”میں پہلی بار پاکستان آیا ہوں۔ مجھے اذان کی آواز اچھی لگی۔ جب سے آیا ہوں میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کے درمیان رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بجائے اس کے کہ میں میوزیمز یا گیلریوں میں جاؤں۔ مجھے لوگوں کا قرب بہت کچھ دیتا ہے۔“
عینی کے ساتھ گفتگو کے دوران انہوں نے سفید کاغذ پر بجلی بری کا خاکہ بنایا جس کے پہلو سے بچہ جھانک رہی تھی۔ لاہور میں ایک شام کے دوران جب دو نظریوں کے درمیان گرما گرم بحث شروع ہوگئی تو ان کی انگلیاں حرکت میں آ گئیں۔ وہ خاکہ دو ہاتھیوں کا مقابلہ، شیلے پھنکارتے ہوئے ہاتھی ایک دوسرے سے بھڑنے کو تیار تھے۔ دو نظریات کا تصادم۔

عینی کو ناہید سے پہلی ملاقات یاد آئی۔ وہ بالکل آئی لینڈ کے پرانے کو لونیل بنگلے میں رہائش پذیر تھی۔ اب کے وہ ڈیفنس کے ایک بنگلے میں رہ رہی تھی۔ اس تمام عرصے میں اس کی زندگی میں کئی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔
ناہید کی مصوری کے اوائل میں بڑا اجالا تھا۔ افق سے افق تک سب کچھ واضح تھا۔ سایے کا ابہام، خوش رنگی کا جھپاہ اشکال کی بنیادی ہیئت کا استحکام اور سامنے ایک کھلا راستہ دور تک جاتا ہوا۔ فطری رومانیت سے ناتجربہ کاری کو ملاحت ملی تھی۔ چوکنڈی کی قبروں کے پتھروں میں کندے ہوئے نقش و نگار نے ناہید کے دل میں روشنی کی بہت سے لویں جلا دی تھیں۔ اس کے ذہن کو زرخیز کیا تھا۔ اس کی کینوس پر اقلیدی اشکال بننے لگیں۔ بیچ کو مثلثی تقسیم دی۔ شوخ رنگوں میں متانت آ گئی تھی۔ مشاہدے نے تخلیقی حسیات کو نیا موڑ دیا تھا۔ چوکنڈی کے پتھروں کے عکس کو تاثراتی انداز میں بنانا ناہید کی پہلی بڑی کامیابی تھی۔ اس کے بعد کوسموس کے زیرعنوان بنائی گئیں تصویریں، جن میں عرش و ارض کی اشکال وجودیت اور لاوجودیت کا باہمی تعلق نمایاں تھا۔

ناہید بر ذی حس تخلیق کار کی طرح خوشگوار لمحوں کی سرشاری اور محرومیوں سے دوچار ہو کر اظہار کے وسیلے تلاش کرتی ہیں۔ کبھی ہمتیں سلب ہونے کا گمان ہوا تو کبھی آبلہ پائی پر مرہم لگایا۔ کبھی خود فریبی کو محبت کا نام دیا تو کبھی محبت کو متاع حیات سمجھ لیا۔ پھر کچھ عنوان بننے لگے۔ میں ایک عورت ہوں، قسمت کا کھیل، بٹی ہوئی روح، خاموش اذیت۔ ان کی تصویروں کے رنگ مضمحل ہو گئے تھے۔ لیکن وہاں ابہام نہیں تھا بلکہ استعاری وضاحت معنی خیز تھی۔ مگر آرٹسٹ کو ہر وقت یہ احساس رہا کہ بات اصل موضوع سے نہ ہٹ جائے۔ پھر بہت سی اشکال ایک سانچے میں ڈھلتی گئیں۔ مافی الضمیر کی وساطت سے اپنی جگہ بناتی گئیں۔ علامتیں گویا تھیں۔ دو ہاتھ جوڑ سکتے ہیں، نامساعد حالات سے نمٹتے ہیں۔ عورت کے ہاتھ میں چاند ہے۔ پھول، جو قدرت کی خوبصورت تخلیق ہے۔ وہ کچھ دیر کے بعد کمھلا جاتا ہے لیکن اپنے پیچھے ایک دل نشین احساس چھوڑ جاتا ہے۔ کھوئی

ہوئی انفرادیت بحال ہوتی ہے تو قدم آگے کی طرف بڑھتے ہیں۔

علی امام صبح کے ناشتے کے بعد اپنے اسٹوڈیو میں آکر بیٹھ گئے تھے اور گیلری میں ہونے والی نمائش کے بروشر کو سامنے رکھے پریس ریلیز بنا رہے تھے۔ انہوں نے آج شام پریس پہ دیو رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنے اس کام کو بہت باقاعدگی سے کرتے تھے۔

ٹیلی فون بجنے لگا۔ اے یار۔ صبح صبح کس کا فون آ گیا۔ ریسیور اٹھایا۔

''جی سر، میں بلاول ہاؤس سے بول رہا ہوں۔ وزیراعظم صاحبہ نے کہا ہے کہ اگر مہدی حلیس کے کاغذات تیار ہو گئے ہوں تو آپ کل آجائیں۔''

''کاغذات تو تیار ہیں۔ وہ جب کہیں میں آجاؤں گا۔''

''جی ٹھیک ہے کل گیارہ بجے گاڑی آپ کو لینے آئے گی۔''

''نہیں آپ تکلیف نہ کریں۔ میں اپنی گاڑی میں آؤں گا۔ آپ وزیراعظم صاحبہ کو بتا دیں کہ میں کل وقت پر پہنچ جاؤں گا۔''

بحیرۂ عرب کے ساحل پر واقع کولاچی کو نہ صدیوں تک عربی جہاز رانوں کے لیے ایک اہم ارضی مقام رہا۔ نیز اس کے ذریعے بمبئی، بھوپال، شمال مغربی ایران، ترکی اور روس تک تجارتی رسائی آسان تھی۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے آنے کے بعد کولاچی نے تیز رفتاری سے ترقی کی اور اس کا نام کراچی ہو گیا۔ اس دوران کراچی میں ایک منفرد نوعیت کا آرکیٹیکچر بنا جو یورپی، وکٹورین، گوتھک اور مغل فن تعمیر کا فیوژن تھا۔ وہ مقامی مزاج اور دستیاب میٹریل سے مطابقت رکھتا تھا۔ اس دور میں تعمیر کیے گئے میونسپل دفاتر، سرکاری اور فوجی رہائش گاہیں اس امتزاج کی مثال ہیں۔

مہاراجہ ہنس راج جی ہیرا بن چند مہتہ ساحل کے قریب ایسا محل تعمیر کرنے کا خواہش مند تھا جہاں سے سمندر نظر آتا ہو۔ اس نے اس کے لیے جے پور کے آرکیٹیکٹ آغا احمد حسین کا انتخاب کیا۔ آغا نہ صرف راجستھان بلکہ وہ اکبر کے فتح پور سیکری کے فن تعمیر سے بھی متاثر تھا۔ اس طرح جودھ پور کے سرخ اور گذری کے مقامی زرد پتھر سے بنایا گیا یہ عظیم الشان محل مغل فن تعمیر کی تجدید تھی۔ جس میں راجستھانی طرز تعمیر کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ 18500 مربع گز پر تعمیر کیا گیا یہ عظیم الشان مہتہ محل، راجپوت شہزادوں کے اینگلو امریکن بنگلوں سے نمایاں طور پر مشابہ نظر آتا ہے۔ آغا احمد حسین نے ایم آر کیانی روڈ پر واقع ہندو جمخانہ بھی

ڈیزائن کیا تھا۔ موہٹہ پیلس کے بیرونی حصے پر ہشت پہلو مینار، کھڑکیوں پر پرندوں کے پروں اور پتھروں میں کندہ پھولوں اور موروں کے موٹیف سے اس سہ منزلہ عمارت کو تخلیق کا شاہکار بنا دیا ہے جو 1920ء میں تکمیل کیا گیا تھا۔

تقسیم کے بعد موہٹہ پیلس وزارت خارجہ کے استعمال میں تھا۔ جسے بعد میں فاطمہ جناح نے خرید لیا تھا اور اس کا نام قصر فاطمہ ہو گیا۔ وہ اپنی وفات تک اس میں مقیم رہیں۔ فاطمہ جناح کے انتقال کے بعد اس لق و دق محل میں ان کی بہن شیریں جناح 1980ء تک رہائش پذیر رہیں۔

علی امام نے بے نظیر بھٹو کے ساتھ ایک ملاقات کے دوران موہٹہ پیلس کی زبوں حالی کا ذکر کیا اور اسے میوزیم بنانے کی تجویز پیش کی تو انہوں نے اپنی دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ اس کی بحالی کے لیے پروپوزل تیار کریں۔ اس وقت تک موہٹہ پیلس کو سندھ حکومت نے خرید لیا تھا۔

بلاول ہاؤس کے باہر گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگی تھیں۔ علی امام نے ان گرانقدر چمکتی ہوئی گاڑیوں میں اپنی سیکنڈ ہینڈ الٹسن کھڑی کر دی۔ گاڑی سے باہر نکلے۔ انہوں نے براؤن سوٹ پہن رکھا تھا۔ گارڈ ایک پرانی سی کار میں وارد ہونے والے دراز قد وجیہہ شخص کو تجسس نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ علی امام اپنی بغل میں فائل دبائے آگے بڑھے۔

"جی صاحب آپ نے کس سے ملنا ہے۔"

"وزیراعظم سے۔ ان سے میں نے ملاقات کا وقت لیا ہے۔"

"لیکن صاحب اس وقت تو میٹنگ چل رہی ہے۔ وزیراعظم وزیروں کے ساتھ مصروف ہیں۔"

"آپ اندر اطلاع کر دیں۔"

گارڈ استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ تھوڑی دیر میں سفید کپڑوں میں ملبوس ایک شخص تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا علی امام کی طرف آیا اور انہیں لے کر سیدھا اندر چلا گیا۔

وزیراعظم کابینہ کے اجلاس سے خطاب کر رہی تھیں۔ علی امام کو دیکھ کر انہوں نے اپنی بات کاٹی۔ کرسی سے اٹھیں اور کہا۔

"آیئے پروفیسر علی۔ ویلکم۔"

وزیراعظم کی کابینہ کے ارکان کے سر ملے۔ سرگوشی میں ایک دوسرے سے مخاطب ہوئے۔

"یہ کون حضرت ہیں جنہیں آتا دیکھ کر وزیراعظم اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی تھیں۔"

"پتہ نہیں میں نہیں جانتا۔ شاید کوئی آرٹسٹ ہیں۔"

"آرٹسٹ کیسا آرٹسٹ۔ گانے والا ہے کیا۔"

"نہیں یار پینٹر ہے۔ تصویریں بناتا ہے۔"

"تو یہاں کیا کر رہا ہے۔ سائیں یہ گورنمنٹ میٹنگ ہے۔ اس کا یہاں کیا کام ہے۔"

وزیراعظم کے چہرے پر روشن مسکراہٹ تھی۔ وہ علی امام سے کہہ رہی تھیں۔ میں تھوڑی دیر میں فارغ ہو جاؤں گی۔ میں دیکھ رہی ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ نے کام کر لیا ہوگا۔

اب کے یوم آزادی کے موقع پر جشن بہت پرجوش تھا۔ شہر میں بڑی رونقیں تھیں۔ سڑکوں پر بازاروں میں بجلی روشنیاں تھیں۔ اخبار کے ہر ایک پر چند آدمی کا اشتہار لگا تھا۔ اس اصرار کے ساتھ کہ اسے آج ہی چھاپو کہ فلاں فلاں لیڈر نے قوم کو یہ پیام دیا ہے۔ ٹیلی ویژن پر یوم آزادی کی آمد آمد کا ذکر کئی روز تک ہوتا رہا۔ کسی سرپھرے صحافی نے بڑے صوبے کے وزیراعلیٰ سے سوال کر دیا کہ جی اب کے یوم آزادی کا اتنا شور کیوں اٹھا ہے۔ ہم تو کئی عشروں سے آزاد ملک میں رہ رہے ہیں۔ وزیراعلیٰ نے اس طرح اچھلے کر جیسے کرنٹ کا جھٹکا لگا ہو "بھئی زندہ قومیں جشن آزادی منایا ہی کرتی ہیں۔ پھر ہماری مینڈیٹ لے کر آنے والی حکومت کے دور میں ___ بجلی چلی گئی۔ جملہ ادھورا تھا۔ مگر بات ٹھیک ہے۔ ہم سب کو جشن آزادی مبارک ہو۔" "ہاں یعقوب تمہیں بھی" "یہ یعقوب کون ہے۔ کوئی نہیں۔ ایسے ہی عام سا آدمی ہے۔ خدا جانے اس کی اصل عمر کیا ہوگی۔ مگر خاصا بوڑھا لگتا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ میں آزادی کے بعد پیدا ہوا تھا۔ دو ہزار یعقوب۔ شہر کی اونچی عمارتیں، پلازے اور بنگلے پینٹ کرتے کرتے اس کی کمر دوہری ہو گئی ہے۔ مگر وہ اب بھی رنگ اور برش کی بالٹیاں کندھوں پر لٹکائے کمند کے ذریعے چھت پر چڑھ جاتا ہے۔ استقلال، یقین محکم، جفاکشی۔ یعقوب کی بیوی اسپتال میں تھی وہ جشن آزادی کی بتیاں دیکھنے نہیں گیا۔ اس کی جھگی میں بجلی بھی نہیں۔ وہ بھلا اسے رنگ برنگی بتیوں سے کیسے کہتا ___ کہہ رہا تھا بہت دن سے بیماری نہیں گئی۔ بہت تنگی ہے۔

سترھویں صدی کے ایک فرانسیسی نقاد نے کہا تھا کہ آرٹ کا مقصد نہ کچھ ثابت کرنا ہے۔ نہ کچھ سکھاتا ہے۔ بلکہ خوش کرنا ہے۔ اگر آرٹ مسرت کی تخلیق نہیں کرتا تو وہ ناقص ہے۔

سلیمہ ہاشمی کو اس سے اتفاق نہیں ہے کہ "یہ بات پرانی تہذیبوں سے مطابقت رکھتی تھی، جب فن برائے فن ایک ضرورت تھی۔ جیسے تہذیب سے قبل کے زمانوں میں مصوری یا فن کی کوئی بھی صنف ایک سحر کی مانند تھی۔ وقت کے ساتھ

معاشرتی ڈھانچے میں تبدیلی آتی رہی تو فن کا مقصد بھی بدلتا رہا۔ یہ بھی ہوا کہ فن مصوری نے مصر اور عراق کی پرانی تہذیبوں میں ملک، مذہب اور معاشرے کی خدمت کی۔ فن وقت کے اظہار کا وسیلہ ہے۔

جب اظہار پابند ہو تو تخلیق کار اپنی بات علامتوں اور استعاروں کے وسیلے سے کہنے لگتا ہے۔ ناخوشگوار اور ناموافق حالات کے پس منظر میں امید کی جوت جاگتی ہے، تو شاخوں کے پتوں کے رنگ روشن ہونے لگتے ہیں۔ سلیمہ ہاشمی کی تصویروں میں انسانی جسم کے خدوخال بیداری کی علامت ہیں۔ نسائی پیکر اس پرعزم عورت کا عکس ہے جو معاشرے میں اپنی انفرادیت کو منوانے کا تہیہ کر چکی ہے۔ وہ جوگ دھیان میں آنکھ کھولنے والے بچے کے لیے فکرمند ہے کہ جب وہ بڑا ہوگا تو اس کا وجود کیا صورت اختیار کرے گا۔ ناسازگار حالات میں یوٹوپیا ایسی دنیا ہے جہاں اجتماعی اطمینان ہو۔ اس کی یہ خواہش رنگ و نقش میں کئی پہلو بدلتی ہے۔ کئی شکلیں اختیار کرتی ہے۔

معین فاروقی نے کراچی کو مادی طور پر پھیلتے اور انسانی رشتوں کو سکڑتے ہوئے دیکھا۔ گنجان آباد شہری زندگی کے کردار، بلند عمارتوں میں گھرے ہوئے۔ میکانی انداز میں اپنی سمت کا تعین کرنے سے قاصر افراد، اپنے آپ میں سمٹے ہوئے تنہا لوگ، انہیں نہ اپنے فیصلوں پر یقین ہے نہ اپنی ذات پر اعتبار۔ معین کی تصویروں کے چہرے پریشان خاطر اور اندرونی بے اطمینانی کا شکار نظر آتے ہیں۔ ان کی نظروں میں حیرت اور تعجب ہے۔ وہ لوگ جو محبت کے جذبے سے عاری ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے قریب رہ کر اپنے درمیان اٹھنے والی دیوار کو گرانے کی خواہش رکھتے ہیں اور نہ ہمت۔ معین کے انسانی پیکر جانوروں کے خاکوں کے جلو میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ جانور کو رفیق بنا کر اس کا وجہ بن جاتے ہیں یا یہ انسان کی وحشیانہ کیفیات کی علامتیں ہیں۔ مچھلی، پانی سے باہر کی مچھلی، بے کلی اور اپنے وجود کو ختم ہوتے محسوس کرنے کی کیفیت۔ معین بذات خود ایک حسین اور نرم گو شخصیت ہیں۔ لیکن تصویر بناتے وقت وہ ایک ایسے مرد ہیں جنہیں عورت درندہ صفت دکھائی دیتی ہے۔ اس کے چہرے پر وحشت اور مایوسی ہے۔ وہ صورت حال سے ناخوش دکھائی دیتی ہے۔ جس کے پہلو میں میز پر اپنا پاؤں رکھے بلی کی آنکھوں میں تجسس اور حیرت ہے۔

شہناز نے بچن کا چولہا بجھا دیا۔ موسم خاصا گرم اور مرطوب ہو رہا تھا۔ اس نے دوپٹے کے پلو سے گردن کا پسینہ پونچھا اور ڈائننگ روم کے پنکھے کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا کہ اسے باہر کے برآمدے میں کچھ قدموں کی آواز آئی۔ سوچنے لگی فریدہ ہوگا۔ امام صاحب نے تاکید کی تھی کہ کلفٹی کی نمائش کی خبر لگ چکی ہے۔ خریدار بھی آنے شروع ہو گئے ہیں لیکن بہت سی تصویریں ابھی تک

فریم نہیں ہوئی تھیں۔

''ممی'' آواز آئی۔ شہناز بوکھلائی۔ وہ کل شام احسن کے بارے میں امام سے شکایت کر رہی تھی کہ بہت روز سے اس کا فون نہیں آیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازے کی چرچراہٹ سے چونکی، دیکھا تو احسن کھڑا تھا۔ ''ارے بابا، یہ تم ہو۔ تم نے کوئی فون نہیں کیا۔ نہ آنے کی اطلاع دی۔ تم خیریت سے تو ہو۔ ہاں ابو وہ اسٹوڈیو میں ہیں۔ لیکن بابا۔''

وہ احسن کو چپٹائے یہ سب کہے جا رہی تھی۔ احسن ڈینم کی شارٹس پر دھاری دار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ پاؤں میں جوگرز تھے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی سامان نہیں تھا۔

''سنیں۔ احسن آیا ہے۔''

احسن!'' امام نے حیرت سے اسٹوڈیو کے دروازے سے جھانکا۔

''امی میں بالکل خیریت سے ہوں۔ بس آپ کی یاد آئی۔ میں نے پاسپورٹ جیب میں رکھا۔ ایئرپورٹ آ کر کریڈٹ کارڈ سے ٹکٹ خریدا اور جہاز میں بیٹھ گیا۔'' شہناز مارے خوشی کے ہنس رہی تھی اور اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔

''بس بیٹا اپنے باپ کا بیٹا۔'' امام نے قہقہہ لگایا۔ ''یار تم نے بہت اچھا کیا۔ ہماری بھی اداس ہو رہی تھی۔ پڑھائی ٹھیک چل رہی ہے نا۔ کیا مفکی سے بات ہوئی۔ بہت دن سے اس کا فون نہیں آیا۔'' امام احسن کو گلے لگاتے وقت جذباتی ہو رہے تھے۔

بے نام ٹیلی فون کالز پر گیلری کو بند نہ کرنے کی صورت میں بچوں کو اغوا کرنے کی دھمکیاں ملنے لگیں تو اسی میں عافیت تھی کہ مفکی اور احسن کو امریکہ بھیج دیا جائے۔ مفکی جس لڑکے کو پسند کرتی تھی وہ بھی امریکہ میں ہی تھا۔ ان دونوں کی شادی کا معاملہ طے ہوا۔ یہی مناسب خیال کیا گیا کہ شادی کی رسم وہیں ادا کر دی جائے۔ علی امام اپنی نظریاتی اصول پسندی کے تحت امریکہ نہیں جانا چاہتے تھے۔ ناچار خواستہ شہناز اکیلی وہاں گئی اور بیٹی کو رخصت کیا۔

خوش قامت، گوری رنگت، چہرے پر مہاسوں کے چھوٹے چھوٹے نقطوں نے شخصیت کی جاذبیت میں اضافہ کیا تھا۔ یہ لیتی لطیف تھیں۔ جن کی سولو نمائش شہر کا ایک اہم واقعہ تھا۔ لیتی کی تصویروں کو دیکھنے بہت لوگ آئے تھے۔ اس جمگھٹے میں احمد پرویز بھی شامل تھے جو پراشتیاق نظروں سے لیتی کی تصویروں کو دیکھ رہے تھے۔

''تمہیں پتہ ہے۔'' مفنی نے اپنے ایک ساتھی صحافی کے کان میں کھسر پھسر کی۔ ''احمد پرویز لیتی کے لیے ''گھیں'' ہو چکے ہیں۔ وہ ہنسا۔ ''میں نے بھی سنا ہے۔''

مفنی کہہ رہی تھی'' مجھے پچھلی بار ملے تو انہوں نے بتایا کہ وہ رات بھر ساحل سمندر پر ریت پر سوئے رہے۔ کہنے لگے۔

"یار مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب سویا ہوا۔ میں آنکھیں موندے پڑا تھا کہ میں نے لتی کے چہرے پر نور دیکھا اور میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔"

مصوری کے ابتدائی مراحل میں لتی نے ایکسپریشنسٹ انداز اپنایا تھا۔ وہاں سفید رنگ نمایاں تھا۔ مکعب، مخروط، دائرہ، دھارے یا اشکال ان کی کمپوزیشن کی اساس تھیں۔ ان تصویروں میں ایک ابہام تھا۔ دیکھنے والی نظر کی جمالیاتی تسکین ضرور ہوتی تھی۔ لیکن ہر ایک نے اپنے اپنے معانی اخذ کیے۔ بعضوں نے اس میں فرانسیسی ادیبہ انائس نن کی تصنیف ایلینا کے عکس نظر آئے۔ لتی شادی کے بعد جتی آنا ہو گئیں اور وہ تارک وطن ہو گئیں۔ کئی برس بعد لوٹیں تو ان کی تصویروں کی ہیئت یکسر تبدیل ہو چکی تھی۔ اب کے وہ محض جمالیاتی مسائل نمٹاتی ہوئیں نظر نہیں آئیں۔ پہلے جیسی پھیلی ہوئی سفیدیوں میں چھدرے چھدرے رنگ، کہیں الگ الگ اور کہیں گڈمڈ تھے۔ وہاں رنگ و نقش کا اس قدر ہجوم نہیں تھا کہ وہ گرد و پیش کی وسعتیں نگل جائیں۔ وہ سب رومان پرور تھا، جیسے مٹھنے کے سرمئی سماں میں شوخ اور روشن رنگوں کے پھریرے اور ٹکڑیاں خواب آلود کیفیت طاری کر دیں۔ لتی امریکی تہذیب و تمدن میں، جانی پہچانی صورتوں، ماحول اور دیکھے بھالے مناظر سے دور، اغیار کی بھیڑ میں۔ اس یوں تنہا دینے والے مشاہدے کے بعد لتی کی مصوری میں رمزیت شامل ہو گئی تھی۔ انہوں نے احساس کی اتھاہ گہرائیوں کو دریافت کیا تو تصویر گھمبیر ہو گئی۔ لیکن وہاں سرتاپا وجود نہیں تھا بلکہ اس کا کل لوٹ کر بطور صفت استعمال ہوا۔ وہاں نوحہ طبعی نہیں بلکہ احتجاج تھا۔ بے اطمینانی تھی۔ مگر انسان ناتواں نہیں ہے۔ بے حس بھی نہیں۔ وہ ناموافق حالات میں لپٹا ہوا بھی اظہار کی سکت رکھتا ہے۔

"شانو" علی امام نے شہناز کو آواز دی۔ "تیار ہو۔ ارے بھئی جلدی کرو۔"

"جی میں بس ایک منٹ میں آتی ہوں۔"

گرمیوں کی شام تھی۔ ہوا تیز تھی۔ امام منہ میں پائپ دبائے اخبار پڑھتے ہوئے شہناز کا انتظار کر رہے تھے۔ سامنے طارق بہادر کھڑا تھا۔ اس کے بغل میں کچھ کتابیں تھیں۔ طارق نرسری کے قریب رہتا تھا۔ وہ ہر دوسرے روز آ جاتا۔ کچھ دیر باتیں کرتا۔ آرٹ کی کتابیں لے جاتا۔

"ٹھیک ہے طارق۔ تم یہ کتابیں لے آئے ہو۔ مجھے ضرورت تھی۔"

"سر، میں نے کچھ نئی تصویریں بنائی ہیں۔ آپ وقت دیں تو میں لے آؤں۔ آپ دیکھیں گے تو پسند آئیں گی۔ اس بار میں نے مختلف کام کیا ہے۔"

"اس وقت تو ہم باہر جا رہے ہیں۔ ایسا کرو کل گیارہ بجے آجانا۔"

شہناز کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے کتھئی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ طارق تعظیماً کھڑا ہوا۔

"بھابی۔ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔"

امام ہنسے۔ "ارے بھئی ساڑھی اگر میرے ساتھ لپٹی ہو تو مجھے وہ بھی اچھا لگنے لگتا ہے۔ پھر یہ تو شاہ نو ہے۔" طارق نے رخصت لیتے ہوئے کہا۔ "میں کل صبح حاضر ہوں گا۔"

طارق جاوید نے ہوش سنبھالا تو دیہی ماحول کے بہت سے منظر سامنے تھے۔ کبڈی، کشتی، مرغوں کی لڑائی، گھوڑوں اور بیلوں کی دوڑیں۔ جب وہ گاؤں کی عورتوں کی تصویریں بناتا تو ڈانٹ پڑتی۔ طارق کو مصوری میں اپنی جگہ بنانے کے لیے برسوں تک محنت کرنی پڑی۔ شروع میں ان کے ہاں ابہام اور تذبذب تھا لیکن تسلسل بھی تھا۔ وہ ارتقائی عمل کے مراحل سے گزرتا رہا۔ مشق سے اظہار کی اساسیت میں استحکام پیدا ہوا۔

ان کے ہاں خوش امیدی نمایاں رہی۔ وہ شہروں کی گنجان آبادی سے وکھ اخذ کرنے کے بجائے اپنے گردوپیش سے اور نکل جاتے ہیں۔ جہاں پتنگ ہیں، جھونپڑیاں ہیں، کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اور البڑ میار ہیں ہیں۔ انہوں نے ان کے منظر کو علامت کے طور پر استعمال کیا جیسے بیل محنت اور سورج توانائی کی علامتیں ہیں۔ وقت کے ساتھ جزئیات نگاری کا گھنا پن ہلکا پڑا تو سطح کی تقسیم اور خط و نقش میں توازن پیدا ہوا۔ رنگوں کی شوخی میں ملاحت آئی تو مجموعی تاثر میں دلکشی پیدا ہوئی۔

عمران میر ان نوجوان مصوروں میں سے ہے جو علی امام کی حوصلہ افزائی سے پروان چڑھے تھے۔ عمران کی برخورداری اور تشکر کا یہ عالم تھا کہ وہ علی امام کو اپنا معبد تصور کرتے تھے۔ گیلری میں عمران کی کیوبک تصویروں کی نمائش لگی تھی۔ امام کہہ رہے تھے۔ "مجھے معلوم تھا کہ عمران میر کی ایک بھی تصویر نہیں بکے گی۔ لیکن میں اسے نمائش دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا کہ اس کا کام بہت اچھا ہے۔ وہ ایک ذہین کیوبسٹ پینٹر ہے۔"

کیوبزم سے مراد وہ طرزِ مصوری ہے۔ جس میں مفعول کو تجریدی اپروچ کے بعد ٹھوس اقلیدسی اشکال میں پینٹ کیا جاتا ہے۔ یورپ میں کیوبزم کی تحریک دراصل امپریشنسٹ دور کا ردعمل تھا جس میں رنگ اور روشنی پر زور دیا جاتا تھا۔ پال سیزان نے کہا تھا کہ فطرت کی ہر شے دائرہ، مخروط اور سلنڈر سے لمبوباتی ہے اور مصوری میں مدعا بیان کرنے کے لیے انہی بنیادی

اشکال کا استعمال کیا جاتا ہے۔ کیوبسٹ اپنے مدعا کے مختلف زاویے اس طرح پیش کرتا ہے کہ آپ اسے حقیقی زندگی میں نہیں دیکھ سکتے۔ کیوبسٹ آرٹ ورک میں اوبجیکٹس توڑتے ہیں۔ پھر تجزیے کے بعد انہیں ازسرِنو جوڑا جاتا ہے۔ کیوبزم نے مصوری میں نئے ایڈیئم کی بنیاد ڈالی تھی۔ بعض اوقات کیوبزم حقیقت سے دور الگ نظر آتا ہے۔ دراصل یہ زیادہ حقیقت پیش کرنے کی کوشش تھی کیونکہ یہ اوبجیکٹ کے مختلف پہلوؤں کو اس طرح بیان کرتا ہے۔ جیسے آپ اس کے اردگرد گھوم رہے ہوں۔ کیوبزم کے آغاز میں لینڈ اسکیپس، فگرز اور اوبجیکٹس کو فطری اشکال کی تحلیل کے بعد پیش کیا گیا۔ پھر وہ اشکال بتدریج غیر واضح اور مبہم ہوتی گئیں اور ان کے رنگ شوخ تر اور روشن ہو گئے۔

عمران میر کا کام اس کے روشن اور شوخ رنگ کیوبزم کے ارتقائی دور کی عکاسی تھیں۔ سرخ، نارنجی، زرد، نیلے رنگوں کے مکعبوں کا امتزاج، گیلری کے ہال میں خوش رنگ مکعبوں سے مزین مجسمے۔ عمران نے ریو بیک کیوبز کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو ایک دوسرے کے اوپر ترتیب دے کر مجسمہ سازی کو جدید اور تجریدی وضع دی تھی۔ وہ جوان کی اپنی اختراع تھی۔ اس امر کی تصدیق تھی کہ مکعبوں کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر کے ہر سمت سے ایک نیا تاثر پیدا ہوتا ہے۔

شام کا وقت تھا۔ کچھ آرٹ اسٹوڈنٹس ملنے آ گئے تھے۔ امام انہیں لے کر اسٹوڈیو میں آئے۔ کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ معاً کسی کی آمد کی آہٹ سنائی دی۔ ان کے ایک دوست آئے تھے۔ وہ جو شہر کے ممتاز آرٹ کولیکٹر تھے۔ انہیں اچھی تصویر کی پہچان تھی۔ لیکن ان خاکوں کے اصل ہونے پر شک گزرا تو علی امام کی رائے جاننے کے لیے چل پڑے۔ کہہ رہے تھے۔

"کوئی شخص یہ خاکے لے کر میرے پاس آیا تھا کہ یہ صادقین کے ہیں۔ لیکن مجھے اس کا یقین نہیں ہے۔"

امام نے سفید کاغذ پر مارکر سے بنائے ہوئے ان خاکوں کو دیکھا اور ایک ماہر جوہری کی طرح کہا۔ "یہ سب فیک ہیں۔"

صادقین کے انتقال کے بعد ایک ہوٹل میں ان کی خطاطی اور خاکوں کی نمائش منعقد ہوئی۔ منتظمین کا کہنا تھا کہ وہ بہت سی تصویریں بنا کر ادھر ادھر ڈال دیتے تھے۔ ان کی کبھی نمائش نہیں ہوئی۔ اس لیے یہ بہت نادر فن پارے ہیں۔ صادقین کے بہت سے مداح اس نمائش کو دیکھنے گئے لیکن جنہیں صادقین کے کام کی پہچان تھی وہ مایوس لوٹے۔ وہاں کچھ بھی صادقین کا نہیں تھا۔

صادقین سے مینی کی کئی ملاقاتیں ہوئیں پہلے پہل وہ جب ان سے ملی تو وہ آرٹس کونسل کراچی میں رہتے تھے۔ وہاں کی بک شاپ، گیلری اور کیفے ان کی بودوباش کے گوشے تھے۔ اس روز وہ کیفے میں بیٹھے تھے۔ چائے منگوائی۔ بیرا پانی کا ایک گلاس بھی لے آیا۔ باتوں باتوں میں صادقین کا ہاتھ لگا اور گلاس الٹ گیا۔ بیرا میز صاف کرتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ "ہر روز یہی ہوتا ہے۔" صادقین کو پروا نہیں تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور اپنی دھن میں باتیں کرتے رہے۔

وہ ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر شہر سے غائب ہو گئے۔ عرصے بعد لوٹے تو وہ نیپا میں مقیم تھے۔ مہربانوں نے یہ جھوٹی اڑائی کہ صادقین بیشتر ابتر ہو گئے ہیں۔ اس روز مینی ان سے ملنے گئی تو وہ ابھی سو کر اٹھے تھے۔ ان کی رباعیات چھپ چکی تھیں جس کی کتابت انہوں نے اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔ نیپا کے چھوٹے چھوٹے گھروں کے ڈرائنگ روم میں بید کی کرسی پر بیٹھے باتیں کرنے کے دوران بتایا کہ وہ آٹو بائیوگرافی لکھ رہے ہیں۔ اس کے چند اوراق مینی کو دیئے۔ جو مینی نے اپنے پرچے میں شائع کر دیئے۔ ایک روز مینی کے دفتر میں ان کا فون آیا۔ کہہ رہے تھے۔ "بھئی تم میری سوانح عمری کے کچھ اوراق لے گئی تھیں۔ وہ مجھے واپس کر دو۔"

"میں تو ان کی فوٹو کاپی لے کر آئی تھی۔ ویسے بھی وہ شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے انہیں اسکین کر کے جوں کا توں شائع کر دیا تھا۔"

"وہ مسودہ میرے پاس نہیں ہے۔" صادقین پریشان تھے۔ مینی نے وعدہ کیا کہ وہ پرچا انہیں پہنچا دے گی۔

زندگی کے آخری برسوں میں ایک نوعمر لڑکا ان کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ وہ ان کا شاگرد اور معاون بھی تھا۔ ایک بار معلوم ہوا کہ صادقین علیل ہیں اور جناح اسپتال میں داخل ہیں۔ مینی وہاں پہنچی تو پرائیویٹ وارڈز کے صحن میں ایک طویل و عریض بینر ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ اتنے روز تک اسپتال میں بغیر کسی کام کے رہنا صادقین کے لیے بہت مشکل تھا۔ انہوں نے رنگ اور کینوس منگوایا اور خطاطی کرنے لگے۔ جو اس کی گواہی بھی تھی کہ صادقین یہیں کہیں، آس پاس میں موجود ہیں۔ مینی سے گفتگو کے دوران ان کا شاگرد بھی موجود تھا۔ یکدم بولے۔ "ارے بھئی انور! مینی مسائل کے حل کے لیے مشورے بھی دیتی ہیں۔ تمہارا کوئی مسئلہ ہو تو ان سے کہو وہ اس کا حل بتائیں گی۔" انور کھسیانی ہنسی کے بعد شرما گیا۔

اب کے صادقین سے ملاقات فیڈرل بی ایریا میں ان کے عزیزوں کے گھر پر ہوئی۔ صادقین لاہور میں آٹھ سالہ قیام کے بعد کراچی لوٹے تھے۔

"آپ کا جی کراچی سے کیوں بھر گیا تھا۔"

"دیکھو ہر شہر کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ میں تو صرف چند روز کے لیے لاہور گیا تھا۔ مگر اپنے قیام کے دوران مجھے محسوس ہوا

کہ لاہور کے مزاج اور میرے مزاج میں ہم آہنگی ہے۔ ٹھیکیداری کے لیے کراچی موزوں ہے۔ جبکہ میری افتادِ طبع قلندرانہ ہے۔ لاہور میں میرے رہنے کی وجہ بجز روحانی، کوئی دنیاوی یا مادی نہیں تھی۔ لاہور کا مزاج فقیرانہ ہے۔

"مثلاً۔۔۔"

"کچھ وہاں کے پیڑ، کچھ پتے، کچھ لوگ، کچھ چوپاں، ان تمام چیزوں کا ایک ثقافتی انداز ہے۔ ماحول میں مروت ہے۔ زندگی میں ٹھہراؤ ہے۔ سکون ہے۔ جمعیتِ خاطر کے ساتھ کام کرنے والا ماحول ہے۔ مگر مفاد پرستوں نے وہاں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اگر میں خاک نشینوں کے انداز میں لاہور میں پڑاؤ ڈالے رہا۔ مخلوق کے انبوہ میں ان کی قدر دانیوں سے قطع نظر، مفاد پرستوں کا شر اور حسد بھی لاہور میں رہنے کی بنیادی وجہ ہے۔ شر پسندوں نے اس تقسیم کے خلاف معاندانہ مہم کا آغاز کیا۔ میرے خلاف احتجاجی جلوس نکالے گئے۔ نمائش گاہ میں آتش گیر مادے رکھے گئے اور نہ جانے کیا کچھ ہوا۔ اس سب کے بعد تخلیقِ فن لازمی ہو گیا تھا۔ میں نے منافقانہ رویہ یا طالبانہ سانچے میں ڈھلی ہوئی اقدار کے خلاف فنکارانہ جہاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس صورتِ حال میں میدانِ جنگ میں استقلال کے ساتھ ثابت قدم رہنا قلندرانہ ادائے آشنائی اور درویشانہ حق آگاہی میرا شیوہ رہا ہے۔"

صادقین بہت مشکل الفاظ بے ساختہ استعمال کرتے تھے۔

"آپ نے لاہور میں کچھ تو سامانِ دل لگی پیدا کیا ہوگا۔" عظمیٰ نے کوشش کی کہ سوال کو اس پیرائے میں ادا کرے کہ وہ صادقین کے لہجے سے میل کھا جائے۔

"ظاہر ہے۔ دل لگی کا سامان کچھ میں نے پیدا کیا کچھ خود بخود پیدا ہو گیا۔ لاہور میں میرے قیام کی وجہ بزرگانِ لاہور کرم فرمانِ لاہور اور معیشانِ لاہور کی محبت بھی ہے۔ لاہور کی آب و ہوا فنِ خطاطی کے لیے موزوں ہے۔ اس لیے کہ یہ شہر صدیوں سے خطاطی کا مرکز چلا آ رہا ہے۔ اس شہر میں میرا فن کسی منطقی نتیجے پر نہیں تو جمالیاتی نتیجے پر پہنچ گیا ہے۔"

صادقین لاہور میں شملہ پہاڑی پر رہتے تھے۔ اس کے بارے میں انہوں نے کہا۔ "میں پہاڑ کی چوٹی پر رہتا ہوں۔ پیڑوں میں سے جھانکتے ہوئے جھروکے ایسے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں کہ پہلی بار اس جگہ کو دیکھ کر اس قدر مسحور ہوا کہ وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ میں کئی کئی ماہ پہاڑی سے نہیں اترتا تھا۔"

"روٹی پانی کا بندوبست کیسے ہوتا ہے۔" عظمیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

"یوں سمجھ لیں کہ روز مند وہی کا مزار تھا۔ شام ہوتی تو لوگوں کا ایک ہجوم چڑھاوے لے کر چلا آتا۔ ویسے بھی ہم فقیروں کی ضروریاتِ زندگی زیادہ نہیں ہوتیں۔"

صادقین لمحہ بھر کو رک کے پھر گویا ہوئے۔ ''میں ہر وقت کام کرتا رہتا ہوں۔ میرے لیے دن رات کا کوئی تصور نہیں ہے۔ نہ جانے کب سو جاتا ہوں، کب جاگتا ہوں۔''

عنبی جب صادقین سے ملاقات کے لیے آئی تھی وہ بڑے انہماک سے ایک تصویر بنا رہے تھے۔ اس دوران بجلی چلی گئی۔ شدید گرمی تھی۔ صادقین نے ایک سفید کاغذ کی شیٹ قالین پر رکھی۔ ان کے قریب مختلف رنگوں کے مارکر موجود تھے۔ کہنے لگے۔ آج میں تمہارے لیے تصویر بناؤں گا۔ اس دوران عنبی کا سوال تھا۔

''آپ کراچی کیسے آئے۔''

''سچ بتاؤں۔ دیکھو یہ بات کسی سے نہ کہنا۔ مجھے ایک لڑکی اپنے ہمراہ لندن لے جا رہی تھی۔ میں یہ سوچ کر کراچی آ گیا کہ یہاں چند روز گوشہ نشینی میں گزاروں گا۔ میں اس کے ہمراہ کراچی آیا۔ پھر مجھے موقع ہی نہ ملا کہ اس سے ملاقات کر سکوں۔ میں یہاں رہ گیا اور وہ لندن چلی گئی۔''

بجلی نہیں آئی تھی۔ صادقین پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ 3 منٹ گزر گئے۔ صادقین نے کہا۔ ''بس میں اس سے زیادہ نہیں بنا سکتا۔ گرمی بہت ہے۔'' مگر وہ تصویر مکمل ہو چکی تھی۔ صادقین نے اپنے دستخط کے ساتھ 79-6-16 کی تاریخ درج کی تھی۔

''بھئی میں تو تین روز کے لیے یہاں آیا تھا، تم نے پھر بھی مجھے پکڑ لیا۔''

صادقین دوبارہ لاہور نہیں گئے۔ وہ کراچی کے فریئر ہال کی چھت کی تزئین میں لگ گئے تھے۔ پاکستان کے مائیکل انجیلو کا یہ آخری ٹھکانہ تھا۔

امام صبح سے نکلے ہوئے تھے۔ وہ پہر کو لوٹے تو تھکن سے بے حال ہو رہے تھے۔ شہناز کو آواز دی کہ ایک گلاس پانی لے آئے۔ شہناز کچن میں تھی۔ اس نے چولہا ہلکا کیا۔ ہاتھ پونچھے اور فریج سے پانی کا گلاس لے کر کمرے میں آ گئی۔

''خیریت ہے نا۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے، دکھ رہا؟''

شہناز نے فکرمندی میں سوالات اڑانے شروع کر دیے۔

الفن گیلری جس مکان میں واقع تھی وہ ان دو ماں اور بیٹی کی ملکیت تھا جو گیلری کے عقب میں انیکسی میں رہتی تھیں۔ گیلری سے ملنے والا کرایہ ان کی کل آمدنی کا ذریعہ تھا۔ وہ دونوں انتقال کر گئیں تو جائیداد کے دعوے دار گیلری کو خالی کرنے کا تقاضا کرنے لگے۔ علی امام نے ان تمام برسوں میں بس اتنا ہی کمایا تھا کہ بچوں کو تعلیم کے لیے باہر بھیج سکیں اور گھر چلتا رہے۔

تھوڑا بہت جو پیس انداز کیا تھا وہ اتنا نہ تھا کہ اپنی کوئی جگہ خریدی جا سکے، جس میں گیلری اور رہائش کی گنجائش ہو۔ کچھ دوستوں نے مشورہ دیا کہ بینک سے قرض لے لیا جائے۔

"ہاں میری ملاقات بینک کے پریذیڈنٹ سے ہوئی ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمیں قرضہ دلانے میں تعاون کریں گے۔"

"لیکن وہ قرضہ اتاریں گے کیسے؟" شہناز کو اب نئی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ یا اس نے دل میں سوچا تھا۔ زبان پر لے آئی۔

"آپ کھانا کھا لیں۔ میں نے جلدی فرائی کی ہے۔ فکر نہ کریں۔ کچھ نہ کچھ وسیلہ ضرور بن جائے گا۔ وہاں سوزا کا فون آیا تھا۔ کہہ رہے تھے بمبئی جاتے ہوئے کراچی میں رکیں گے۔"

"پچھلے ہفتے میری سوزا سے بات ہوئی تھی۔ اس وقت ان کا پروگرام فائنل نہیں تھا۔"

"کہہ رہے تھے میں ایک دو روز میں فلائٹ کے بارے میں بتا دوں گا۔" شہناز نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ میں نے پی ایم سے بات کر لی ہے۔ سوزا اس کے ہاں ٹھہریں گے۔"

پرتگال میں پیدا ہونے والا مصور فرانسس کیلئے پیارو جیس کے علاقے مونا فوت کی صبح کی دھند میں ڈیگی گی کا عکس پیش کرتا، وہ دالموئیس دریا کے کنارے ایک سرمئی ان سے متاثر ہوتا یا وہ جوسٹ نت کے جھنڈ کی تصویر کشی کرتا۔ وہ درختوں کے اس پار کے گاؤں کا منظر پیش کرتا تو ان تمام تصویروں میں درختوں کے تنے نمایاں ہوتے۔ تنا زندگی کے استحکام کی علامت ہے۔ طوفان آئیں، آندھی یا بارش، درخت کا تنا مضبوط ہو تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تند ہواؤں سے جھولتے ہوئے طوفان کے گزر جانے کے بعد وہ پھر سے مستحکم نظر آتا ہے۔ پیارو پوسٹ امپریشنسٹ پینٹر تھا۔

فرانسس نیوٹن سوزا لینڈ اسکیپ پینٹر نہیں ہیں۔ وہ ایکسپریشنسٹ ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات کو اپنایا۔ ان کا ایک منفرد انداز ہے۔ وہ گرجوں، عمارتوں کی تصویر بنائیں تو چیزوں کا بیرونی خط نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن ان کی لینڈ اسکیپ کو دیکھ کر پیارو کی طرف دھیان کا جانا ناگزیر ہے۔

عمی کو اس روز سوزا سے ملنا تھا۔ وہ جب پی ای سی ایچ ایس کے بلاک ۲ میں واقع پی ایم کی رہائش گاہ پر آئی تو علی امام بھی موجود تھے۔

''ارے، مجھے تو سوزا سے ملنا تھا۔''

علی امام ہلکا سا مسکرائے۔ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔تم انہی سے ملنا۔اس وقت وہ ایک اور جرنلسٹ سے بات کر رہے ہیں۔ میں ان کی کچھ تصویریں اٹھانے آیا تھا۔

''خیر۔اب آپ کچھ دیر رکیں۔مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔''

سوزا کی تصاویری نمائش کی تاریخ کا اعلان اخبارات میں چھپ چکا تھا۔لیکن ابھی بہت کام باقی تھا۔امام اپنی مصروفیت کی بنا پر فوراً روانہ ہونا چاہتے تھے لیکن انہوں نے عینی کی فرمائش کو ٹھکرانا بھی مناسب نہ سمجھا اور کچھ پس و پیش کے بعد سوزا کے بارے میں بات چیت کرنے پر راضی ہو گئے۔

''میں سوزا کو بمبئی سے جانتا ہوں۔ہم لوگ سب سے اسکول میں ایک ساتھ تھے۔پھر لندن کے قیام کے دوران ان سے ملاقاتیں رہتی تھیں۔لندن میں سوزا کی نمائش پر وہاں کے تمام بڑے اخباروں ڈیلی ٹیلی گراف،گارڈین،ٹائمز وغیرہ نے بہت اچھے ریویو دیے۔مجھے یاد ہے سوزا نے وہاں بلیک اینڈ وہائٹ تصویروں کی نمائش کی۔ان کے اسٹروکس میں روشنی اور سایے کا اتنا خوب صورت امتزاج تھا کہ وہاں رنگوں کی کمی کا احساس تک نہ ہوا۔انڈس گیلری میں سوزا کی پہلی نمائش 1975ء میں ہوئی تھی۔یہ وہ دور تھا کہ ہمارے ہاں گیلری کلچر نہیں تھا۔خریداروں کا مزاج بھی کلچرڈ نہیں ہوا تھا۔اس وقت سوزا کی زیادہ تر تصویریں مغرب کی کمپوزیشن،ایلورا،اجنتا اور کھجوراؤ کے مجسموں جن میں کولہے اور سینے نمایاں تھے،کا مرکب تھیں۔جو کہ اِروٹک تھیں۔انہیں فروخت کرنا بہت مشکل تھا۔خریدار تصویر خریدنے کے لیے ہزار دو ہزار خرچنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔لیکن سوزا کی 50 فیصد تصویریں بک گئیں جو ایک بڑی کامیابی تھی۔

''سوزا کی اگلی نمائش 89ء میں منعقد ہوئی۔انہوں نے متنوع موضوعات پر کام کیا تھا۔وہ ایک اثر پذیر نمائش تھی۔ حالانکہ نقادوں کا خیال تھا کہ ان کے پہلے کام میں زیادہ گہرائی اور گیرائی تھی۔یہ ایک نارمل امر ہے۔شاعر کا ہر شعر، ادیب کا ہر ناول یا افسانہ یکساں طور پر پراثر نہیں ہوتا۔فن کا گراف اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے۔لیکن سوزا کی اس نمائش نے بہت شہرت پائی۔ تصویریں ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ خریداروں میں شعور آ گیا تھا۔وہ تصویر کو سمجھنے لگے تھے۔''

''سوزا کے فن کے بارے میں آپ کی رائے؟''

سوزا کے ذہن میں لوچ ہے۔وہ نہ صرف موضوعات کے حوالے سے بہت متنوع ہیں بلکہ ان میں تاریخ کی کچھ بھی ہے۔وہاں معنی اور مقصدیت ہے۔وہ بلیک اینڈ وہائٹ میں بہ معنی تاثر پیدا کرنے کی تخلیقی صلاحیت رکھتے ہیں۔

''سوزا کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ وہ بہت کنٹروورشل ہیں۔''

"سب بڑے ادیب، شاعر، پینٹرز یہاں تک کہ فلسفی بھی کنٹروورشل ہوتے ہیں کہ وہ جاری کھیل کی بساط الٹ دیتے ہیں۔ یسوع مسیح نے جو خدا کی تعریف کی تو دوسرے نے اسے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ یا گلیلی کا تصور نیا ہے کہ اب دوسرے کی بات سننے کا حوصلہ نہیں رہا۔ لیکن اگر کوئی نئی بات کہہ رہا ہے اس کے دلائل ٹھوس ہیں تو اسے بالآخر تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ موزا کو فن اور زندگی کے فلسفے کی زبان پر کنٹرول ہے۔ اگر اس کا اظہار واضح ہو تو وہ بڑا فن کار ہے۔ ہماری زندگی میں جو کچھ ہے وہ فطرت نے دیا ہے۔ فطرت کی اپنی حرکات ہیں۔ انسان اس کی باز تخلیق کرتا ہے اور جو کرتا ہے۔ مذہب کا بنیادی تصور اور جواز فطرت نے دیا۔ اس لیے فطرت کی مکمل توضیح بہت اہم ہے۔"

اس دوران موزا بھی امام کی گفتگو میں شامل ہو گئے تھے۔ انہوں نے امام کی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ "اگر آپ کو فطرت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تو آپ آرٹسٹ نہیں بن سکتے۔ آپ جو کچھ آج دیکھتے ہیں اس کے ماضی کے بارے میں جانیں۔ تاریخ کے شعور سے بہت سے تاریک گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔ زمین میں دھاتوں اور معدنیات کا پیدا ہونا فطری عمل ہے۔ ہم اس کی کھدائی کرتے ہیں۔ طبعی طور پر ہر چیز حرکت کرتی ہے۔ بیج، پودے، سبزیاں اور جانور فطری طور پر ارتقائی عمل سے گزرتے ہیں۔ اسی طرح سائنسی ایجادات اور ٹیکنالوجی از خود ترقی کرتی ہے۔ مصوری کا فن ان سے الگ نہیں ہے۔ یہ بھی ارتقائی عمل سے جڑا ہے۔ زندگی کا حسن مختلف تصورات کے درمیان ربط قائم کرتا ہے۔ پھر اس کا اسٹرکچر بنتا ہے۔ آپ کو میٹریل فطرت سے ملتا ہے۔ یہ آپ پر منحصر ہے کہ اسے کس طرح استعمال کرتے ہیں۔"

"لوگ فن مصوری میں روایت اور اقدار کی بات کرتے ہیں۔ میں اس کے برعکس سوچتا ہوں۔ آپ جو کچھ ماضی میں کہہ چکے ہیں یا اب کہہ رہے ہیں بھلا اسے کیوں جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ جو دوسرے کہہ چکے ہیں آپ اسے کیوں دوہرا رہے ہیں۔ جو کچھ کل تھا وہ آج نہیں ہے۔ اور آج کل نہیں ہوگا۔"

"آپ نے مختلف بہت سے موضوعات پر پینٹ کیا ہے۔ لیکن اسٹل لائف اور لینڈ اسکیپ فن کے طلبا اپنے ابتدائی دور میں بناتے ہیں جبکہ آپ ابھی بھی ___؟"

"میں نے اسٹل لائف کچھ عرصہ پہلے بنائی تھی۔ اگر اسے دوبارہ بنانا چاہوں تو ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اپنے آپ کو نقل نہیں کر سکتا۔ نئی تصویر کی ہو بہو نقل میں بھی کچھ نہ کچھ نیا ہوگا۔ اسی طرح لینڈ اسکیپ ہے۔ موسم بدلنے کے ساتھ لینڈ اسکیپ کا مزاج بدل جاتا ہے۔ یہی تبدیلی اور جدت ہے۔ میں فطرت کو بدلتے ہوئے دیکھتا ہوں۔"

"ہندوستان کے پینٹرز کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہندو مائی تھولوجی سے نہیں نکل سکے۔"

"کچھ عرصہ قبل تک یہ بات درست تھی۔ انگریز اپنے دور میں اپنی پسند اور مرضی ہم پر مسلط کرتا تھا۔ اس لیے ہم نے

برٹش راج کے کمزور پڑتے ہی پروگریسو آرٹ موومنٹ چلائی۔ ہمارے ہاں کوئی گجراتی مصوری کر رہا تھا جبکہ دوسرا گروہ بنگال والا تھا۔ کوئی چینی طرز میں تصویر بنا رہا تھا۔ ہم اس وقت تک پیرس اسکول آف آرٹ سے واقف نہیں تھے۔ ہماری موومنٹ کا بنیادی مقصد ہندوستانی مصوری کو دنیا کی جدید جہتوں سے روشناس کرانا تھا۔ ہم میٹنگز میں طے کرتے تھے کہ اب کون سے موضوع پر کام کرنا ہے۔

''لیکن تخلیقی کام کی پلاننگ تو نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک فطری عمل ہے۔''

''تبدیلی لانے کے لیے بعض اوقات شعوری کوشش کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ہم صرف موضوع تجویز کرتے تھے۔ اسے بنیاد بنا کر ہر کوئی اپنا اپنا اسلوب اختیار کرتا تھا۔ یہاں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہندو مائی تھولوجی ایک اچھا سبجیکٹ ہے۔ اس پر بے شمار طریقوں سے جدت طرازی کی جا سکتی ہے۔ جیسے حسین (ایم ایف حسین) نے نیوڈز کو زمین کی علامت کے طور پر پیش کیا۔

''پاکستانی مصوری کے بارے میں آپ کی رائے؟''

''مجھے یہاں کوئی اسکول نظر نہیں آتا۔ جیسے پیرس اسکول آف آرٹ ہے۔ رینیسنس کا اسکول ہے۔ البتہ پاکستان میں انفرادی طور پر بڑے مصور ہیں۔ جیسے شاکر علی تھے۔ احمد پرویز اور گل جی ہیں۔ علی امام ایک حساس پینٹر ہیں۔ اجتماعی طور پر ان کی الگ سے پہچان نہیں ہے کہ کسی تصویر کو دیکھ کر یہ کہا جا سکے کہ یہ پاکستان کا آرٹسٹ ہے۔ ویسے بھی میں نے زیادہ تر تصویریں انڈس گیلری میں ہی دیکھی ہیں۔

''ظاہر ہے میرے پاس ملک بھر کے مصوروں کی تصویریں نہیں ہیں۔ مثلاً اس وقت میرے پاس احمد پرویز اور گل جی کی کوئی تصویر نہیں ہے۔'' علی امام نے وضاحت کی۔

دو مختلف درجہ حرارت ایک دوسرے سے متصادم ہو جائیں تو دونوں اپنے اپنے وجود میں ٹوٹتے ہوئے تموج پیدا کرتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے سمندر کی لہر پانی کی ملائم ریشمی تہہ سے ابھرتی ہوئی جب پتھریلے ساحل سے ٹکراتی ہے تو ایک گونج کے ساتھ پھیلتی ہے۔ پھر بڑھتی ہے۔ زمین کے جامد استحکام سے الجھتی ہے۔ نتیجتاً وہاں شور اور خاموشی کی درمیانی آواز پیدا ہوتی ہے۔ اتار چڑھاؤ کے زیر و بم میں رچی بسی مترنم آواز۔ گل جی کے کینوس کو دیکھ کر ابھرنے والا احساس۔

دو مختلف رنگ، دو متضاد رنگ، شوخ اور دھیما، تیز اور ہلکا۔ مختلف مزاج، مختلف درجہ حرارت۔ دو دونوں جب بھی ایک دوسرے سے ملے تو وہاں اضطراب کی لہریں بڑے جوش سے اٹھیں۔ کہیں پھندے بنے اور کہیں گرہیں پڑ گئیں وہ شدت کی

جانب لہرائیں تو کبھی پیچھے کی طرف جھول گئیں اور کبھی چھوٹی چھوٹی خوش رنگ لکیروں کو آغوش میں لے لیا۔ انہیں سیراب کر دیا۔

یہ گل جی ہیں۔ ان کی شخصیت کے تضادات۔ گل جی کچھ لوگوں کو پبلک ریلیشننگ والے لگتے ہیں تو دوسرے ان کی معصومیت اور نرم خوئی سے متاثر ہوتے ہیں۔

ایک دعوت میں وہ مشروب کا گلاس ہاتھ میں لیے ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ باتوں میں مصروف نظر آئے۔ عینی انہیں دیکھ کر آگے بڑھی۔

''گل جی! کیسے ہیں آپ۔ بہت دنوں بعد نظر آئے۔ کہاں تھے آپ۔''

''میں چند ماہ کے لیے نتھیا گلی چلا گیا تھا۔ آرام کرنا چاہتا تھا۔''

''طبیعت ٹھیک ہے نا۔'' عینی نے فکرمندی ظاہر کی۔

''بالکل ٹھیک ہوں۔ بات یہ ہے کہ جب آپ طویل عرصے تک دنیا کے ساتھ رہتے ہیں تو کچھ دنوں کے لیے اپنے آپ کے ساتھ رہنے کو جی چاہتا ہے۔'' پھر ہاتھ میں سنیکس کی ٹرے لیے لڑکی گل جی کی طرف بڑھی۔ گل جی اپنی نوعمر مداح کو کسی اور کی جانب متوجہ پاکر عینی کے قریب کھڑے ہو گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر لگا کہ جیسے وہ وجدانی کیفیت سے دوچار ہیں۔ ان کی آواز کہیں دور سے آ رہی تھی۔

''گزشتہ دو برس میری زندگی کا بدترین عرصہ تھا۔''

''کیوں، خیریت رہی نا۔''

''یار! میرے اندر جو ایک پرندہ گاتا رہتا تھا، وہ خاموش ہو گیا تھا۔''

''خیریت۔'' عینی نے گل جی کو ''چیک اپ'' کیا۔

گل جی نے لاہور ناز ولی سے شاہ فیصل کی پورٹریٹ بنائی۔ وہ ان کی محبت تھی۔ انہوں نے آغا خان کی پورٹریٹ بنائی۔ یہاں ان کا جذبہ عقیدت تھا۔ لیکن جب ضیاء الحق کی فرمائش پر اسلام آباد کی شاہ فیصل مسجد کی تزئین کی تو متضاد آراء سامنے آئیں۔ بعض نے ایک بار پھر گل جی کو مفاد پرست کہا۔ یہ بھی کہ اسلام آباد کی اس عبادت گاہ کی تکمیل کے بعد وہ بیجنگ میں بج گئی اور سلیمن جھیل میں ناکنگ منگلو کے جنون کا اعادہ ہوا۔ اس نوعیت کے جنون کے بنا ایک بڑا منصوبہ ناقص رہتا۔ اس کی اثر پذیری ادھوری رہتی۔

گل جی کے ڈیزائن کیے ہوئے مینار، دیواریں اور گنبد والی شاہ فیصل مسجد اسلام آباد کا لینڈ مارک بن گئی۔ اس طرح کے تمام کام گل جی کا وسیلہ روزگار تھے لیکن جب وہ موج میں آ کر تصویر بناتے تو وہاں رنگ و نقش کا بیان جداگانہ ہوتا۔ وہاں خوش

رنگی، خوش امیدی اور بھرپور زندگی کی حرارت ملتی ہے۔ وہاں آسمانی برق کی سی تیزی اور لپک ہے۔ جیسے وہ تڑپتی ہوئی ظاہر ہوتی ہے، سکڑتی اور پھیلتی ہے اور یکدم غائب ہو جاتی ہے۔ ایک بار پھر ظاہر ہونے کے لیے۔ گل جی کوشش کرنی کے لیے کوئی منصوبہ نہیں بناتے۔ رنگ لگانے کے لیے کسی خط کا سہارا نہیں ہے۔ کوئی پابندی نہیں۔ کوئی نظم و ضبط نہیں۔ لیکن جو کچھ بنتا ہے وہ نازک اور متوازن ہوتا ہے۔ صاف اور ہموار سطح کو کبھی زاویاتی انداز میں تقسیم کیا تو کبھی وہاں ایک دھارا لپٹا ہوا مرکز میں گندھے ہوئے گجروں کی مانند ٹھہر گیا۔ الجھتی ہوئی موجوں میں پروئے ہوئے زمرد، نیلم کی ان تراشی ٹکڑیوں کی شعاعیں۔ گرد و پیش سحر انگیز ہو جاتا ہے۔

قدسیہ نثار اس روز بھی حسبِ معمول صبح نو بجے سے پہلے ہی دفتر پہنچ گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے بیگ میں سے چند کاغذات نکالے اور انہیں سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ ان دنوں سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ اینڈ کرافٹس کی پرنسپل تھیں۔ پیشتر اس کے کہ وہ دن بھر میں کرنے والے کاموں کا جائزہ لیتیں کہ میز پر رکھا ٹیلی فون بجنے لگا۔ قدسیہ چونکیں کہ صبح سویرے کس کا فون آ گیا۔ ریسیور اٹھایا۔ علی امام لائن پر تھے۔

"ارے تم دفتر پہنچ گئیں۔"

"سر، میں تو روزانہ اس وقت تک آ جاتی ہوں۔ خیریت ہے۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے۔"

"ہاں ہاں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ سنو، چائے کا بول دو۔ میں تمہارے دفتر آ رہا ہوں۔"

"جی۔ لیکن ..."

"لیکن کیا۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ میں آ رہا ہوں۔"

"وہ میں اس لیے کہہ رہی تھی کہ ابھی چند روز پہلے آپ کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ آپ آج دورا کیں گے۔"

"تم مجھے خوامخواہ مریض نہ بناؤ۔ میں آ رہا ہوں۔" اور فون بند ہو گیا۔

قدسیہ فکرمند تھی۔ دل میں سو طرح کے وسوسے آ رہے تھے۔ یوں بھی ادارے کے حالات اچھے نہ تھے۔ بہت سے مفاد پرست قدسیہ کی مخالفت پر جتے ہوئے تھے۔ اسے یہ بھی فکر تھی کہ امام آرٹس کونسل کے ریمپ کے ذریعے بالائی منزل تک کیسے پہنچیں گے۔ یہ ان کے لیے اچھا نہیں ہے۔ ٹھہرو، انہیں فون کرتی ہوں کہ میں آپ کے پاس آ رہی ہوں۔ لیکن وہ مانیں گے نہیں۔ ویسے بھی اب تک وہ نکل چکے ہوں گے۔

قدسیہ اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ دیکھا سامنے علی امام کھڑے تھے۔ کھلتے ہوئے زرد رنگ کی شرٹ اور پینٹ میں ملبوس،

منہ میں پانی آ رہا تھا۔

قدسیہ ان کے استقبال کے لیے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ امام بہت اچھے موڈ میں تھے۔

"ہاں بھئی کام ٹھیک چل رہا ہے نا۔ میں نے تمہاری کمیونٹی کیشن والی ورکشاپ کے بارے میں سنا ہے۔ وہ ایک اچھا موضوع تھا۔ اسی طرح کی ٹیچر یا اسٹوڈنٹس کو کام کرنے کے لیے کہیں تو ان کی تخلیقی صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔

"میرے ہاں کل ایڈا کے ہاں ڈنر تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم سے وہاں ملاقات ہو گی۔ البتہ تمہاری تصویریں دیکھیں۔" ایڈا قدسیہ کی دوست تھی۔

یہ بھی ایڈا کی عادت تھی۔ قدسیہ جب بھی کوئی نیا کام کرتی تو وہ بتائے بغیر تصویر اٹھا کر لے جاتی تھی۔ وہ تصویریں نمائش میں شامل نہیں ہوتی تھیں۔

"تمہیں پتا ہے کہ میں نے تمہاری جو تصویریں ایڈا خان کے ہاں دیکھی ہیں وہ کبھی نظر نہیں آئی ہیں۔"

قدسیہ کے چہرے کے رنگ بدل رہے تھے۔ کہ خدا جانے کہ وہ اب مجھے کیا کہنے والے ہیں۔

"ارے بھئی چائے کہاں ہے۔" کہتے میں دفتری چائے کی دو پیالیاں ٹرے میں رکھے کمرے میں داخل ہوا۔

امام نے چائے میں چینی ملاتے ہوئے ایک گھونٹ بھرا۔ "کہنہ اچھی چائے ہے۔"

قدسیہ ہلکے سے مسکرائیں۔ وہ ابھی تک علی امام کے اچانک آنے کا سبب نہ جان سکی تھیں۔ کچھ تجسس تھا، کچھ تذبذب تھا۔

"کیا بتاؤں، مجھے آج تمہارے سامنے دو کنفیشن کرنے ہیں۔" یہ جملہ قدسیہ کے تجسس کو بڑھانے کے لیے کافی تھا۔

"نمبر 1۔ تم اپنی کرئیٹیوٹی کے عروج پر پہنچ چکی ہو۔" قدسیہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"نمبر 2۔ علی امام نے قدسیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم اس ادارے کے لیے بہترین پرنسپل ہو۔" اب قدسیہ کو اپنے پر اختیار نہ تھا۔ آنسوؤں کا دھارا اس کے گالوں پر بہہ نکلا تھا۔ اپنے استاد کے منہ سے تعریف سن کر قدسیہ کو وہ دن بھی یاد آیا جب گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں پہلی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے انہوں نے قدسیہ کی بہت حوصلہ افزائی کی تھی۔

ورجینیا وولف نے اپنے پہلے ناول "ووائج آوٹ" کے بعد خود کو دریافت کیا تھا۔ بدلتے ہوئے مناظر اجنبی لوگوں کے رویے سبھی اور ان کی ترجیحات تخلیقی حسیات کو جلا بخشتی ہیں۔ قدسیہ نے بہت سے ممالک کے سفر کے بعد اپنی اس منطق کو آرٹ دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے، کو مضبوط پایا۔ ہر سفر کے بعد ایک نئی روشنی جنم لیتی۔ دنیا کے بیرونی آبجیکٹس غائب

ہونے گئے تو اندر کا سفر شروع ہو گیا۔ جو ایک تخلیق کار کو فکر کی اتھاہ گہرائیوں تک لے جاتا ہے۔ قدسیہ نے اپنے اظہار کے لیے نشان، علامتوں اور استعاروں کی زبان وضع کی۔ وہ زبان فورم، لائن اور اسٹرکچر کی ہے۔ تب وہ اپنی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے مختلف رنگ دیتی ہیں۔ مثلاً سرخ رنگ خطرہ، زرد جمود اور نیلا پاکیزگی کی علامت ہے۔ قدسیہ کے ہاں پختگی ہے اس لیے وہ وائلڈ گریز استعمال کرتے ہوئے خود کو آسودہ محسوس کرتی ہیں۔ قدسیہ نثار نے وقتاً فوقتاً مختلف موضوعات پر تصاویر کی سیریز بنائیں۔ مگر ان کی نمبر سیریز ایک منفرد خیال کا عکس اظہار تھا کہ انسانی زندگی میں نمبروں کی بہت اہمیت ہے۔ گھر کا نمبر، فون نمبر، شناختی کارڈ کا نمبر۔ ان نمبروں میں سے کوئی ایک ہندسہ غائب ہو جائے تو انسانی وقعت کم ہو جاتی ہے۔ کسی نمبر کے ساتھ صفر لگا دیں تو وہ بڑا ہو جاتا ہے۔ جتنے صفر بڑھتے جاتے ہیں، وہ اسی قدر زیادہ طاقتور ہوتا جاتا ہے۔ قدسیہ کی تصویروں میں حقیقی زندگی کے ایسے حوالے بار بار ملتے ہیں۔ ان کے کام میں تسلسل ہے۔ جس سے تنوع اور جمالیات کے ارتقائی مراحل بتدریج طے ہوتے ہیں اور قدموں کے نشان باقی رہ جاتے ہیں۔

عینی نے بہادر آباد کے علاقے میں واقع جعفر روڈ پر گاڑی موڑی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر موٹر کاروں کی لمبی قطار تھی۔ گاڑی پارک کر کے اس نے بیگ کندھے پر لٹکایا اور وہاب جعفر کے گھر میں داخل ہوئی۔ متذبذب تھی کہ وہ سیدھے ہاتھ کی سیڑھیاں طے کر کے ڈرائنگ روم کا رخ کرے یا گارڈ نے لان کی طرف اشارہ کر کے رہنمائی کی۔ او آج بڑی دعوت ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔ وہاب کے ہاں اکثر چھوٹی بڑی دعوتیں ہوتی رہتی تھیں۔ بے تکلف اپنائیت میں رچی ہوئی نشستیں۔

وہ ذرا آگے بڑھی تو سامنے خالد احمد نظر آئے۔ عینی کو دیکھتے ہی آگے بڑھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کا حال چال پوچھا۔ باربی کیو کی انگیٹھیوں میں دہکتے ہوئے کوئلے کے مرغولوں نے فضا کو پر اشتہا بنا دیا تھا۔ سفید وردیوں میں ملبوس بیرے ٹرے اٹھائے مہمانوں کو مشروبات تقسیم کر رہے تھے۔ ایک بیرہ عینی اور خالد کی طرف بڑھا۔ دونوں نے ایک ایک گلاس اٹھایا۔

"یار عینی، ہم تو اشرافیہ میں شامل نہیں ہیں۔ پھر بھلا ہمیں کیوں بلایا گیا ہے۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے۔ اشرافیہ سے تمہاری کیا مراد ہے۔"

"دیکھو ان بڑے سیٹھوں کے ہاں ایسی دعوتیں اکثر کاروباری ہوتی ہیں۔ جہاں صرف وہ لوگ مہمان ہوتے ہیں جن سے کوئی کام نکلوانا ہو۔ وزیر، بیوروکریٹس، بڑے پولیس افسران، کسٹمز کمشنر۔ ہم تو —"

"یعنی کہ ایک آرٹسٹ دوسرا جرنلسٹ۔"

''ہاں تو۔''

''میں بھی وہاب کو اکثر چھیڑتی ہوں کہ یہ ہمارا سیلف میڈ آرٹسٹ ہے۔ وہ احتجاج کرتا ہے۔ کہتا ہے مجھے سیلف میڈ مت کہا کرو۔ سچ بات تو یہ ہے کہ وہ تاجر، صنعت کار گھرانے میں پیدا ضرور ہوا۔ لیکن وہ ایک نرم دل اور سادہ لوح مصور ہے۔ جس نے خود کو بطور مصور منوانے کے لیے اس سال تک محنت کی۔ تب علی امام انڈس گیلری میں انہیں پہلی نمائش دینے پر آمادہ ہوئے تھے۔''

ہندوستان سے کچھ آرٹسٹ اور آرٹ سپورٹرز آئے ہوئے تھے۔ وہاب نے اس پر تکلف دعوت کا اہتمام انہی کے اعزاز میں کیا تھا۔ وہاں سب کے سب مصور، جرنلسٹ، ٹی وی آرٹسٹ اور اسی طرح کے تخلیق کار قبیلوں کے لوگ مدعو تھے۔ وہاب نے اس موقع پر اپنی نئی تصویروں کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔

ایک بار کراچی کے ایک ہوٹل میں مصوری میں استادوں کی نقل کے زیر عنوان ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہاب ناظر بھی موجود تھے۔ ان پر الزام تھا کہ وہ احمد پرویز کے نقال ہیں۔ وہاب نے نہ تردید کی اور نہ احتجاج کیا۔ بس سفید کاغذ پر جھکے کچھ کرتے رہے۔ مباحثے کے اختتام پر انہوں نے وہ کاغذ بڑھایا۔ تقریب کی کارروائی سے اثر لینے والا احساس۔ جس نے کبھی چوٹ کھائی، کسی بات پر وہ آزردہ خاطر ہوئے تو نوکیلی قلمیں بنتی گئیں۔ لیکن تنقید پر رواداری بھی ضروری ہے۔ منڈیر کے جلو میں تالاب نے سر باہر نکالا اور تیز دھاری لکیروں کو کاٹ دیا۔ پھر ایک نسائی چہرہ اوپر کی طرف اٹھتے، آگے کی طرف بڑھتے اور گرتے ہوئے نقوش کی لپیٹ میں آ گیا۔ فنکار کان میں پڑنے والی آوازوں کو تسلیم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے لیے اپنی روش کو یکسر ترک کر دینا ممکن نہیں تھا۔

کسی اثر انگیز ماحول میں وہاب اس طرح تصویر بناتے ہیں جیسے کوئی شاعر فی البدیہہ شعر کہتا ہے۔ ایک بار امریکی پاپ نغمے کو سنتے ہوئے جو تصویر بنائی تھی اس میں رنگ موسیقی کی دھنوں پر جھوم رہے تھے۔ شوخ زرد نیلے اور سرخ رنگوں نے ایک دلآویز تصویر بنا ڈالی تھی۔

ایک دفعہ علیل ہو کر وہ ہیوسٹن کے اسپتال میں داخل تھے۔ جہاں ہر شے سفید تھی۔ بستر کی چادروں سے لے کر ڈاکٹروں کے اوورآل تک۔ جبکہ وہاب کے اندر سب کچھ سیاہ تھا۔ تاریک تھا۔ انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ لیٹے لیٹے خاکہ کشی کرتے گئے کالی کالی لکیروں اور نقطوں نے تجریدی اشکال ترتیب دی تھیں۔ جن میں ہیجان تھا۔ انسانی چہروں پر اضطراب، خوف اور حیرت چھائی تھی۔ پھر کہیں سے اڑتا ہوا ایک پرندہ ایک شبیہ کے سر پر بیٹھ گیا۔ امید کا پیامبر۔

ابتدا میں مصوری وہاب کے لیے محض ایک ٹائم پاس تھا۔ بہت سے ارتقائی مراحل طے کرنے کے دوران رنگ و نقش کی مشغولیت ان کے شب و روز کا اہم حصہ بن گئی۔ ایک بار ڈاکٹر سلیم الزماں نے کہا تھا کہ آپ جو کچھ پڑھیں اسے بھول

جائیں۔ پھر جو لکھیں گے وہ آپ کا اپنا ہوگا۔ احمد پرویز وہاب کا مطالعہ ہیں۔ لیکن جو کچھ بتاتے ہیں وہ ان کا اپنا ہے۔ وہ جو ان کے مشاہدے، تجربے اور مشق سے نکلا ہے۔ وہاب رنگ و نقش کا فیسٹیول رچاتے ہیں۔ وہ حسن کے تخلیق کار ہیں۔ ان کے ہاں کچھ بھی بلند یا بد ہیئت نہیں ہوتا۔ وہاں کچھ بھی وزن دار نہیں ہوتا۔ ہر شے لطیف اور سبک رو دکھائی دیتی ہے جیسے پانی کا بہاؤ، جیسے ہوا کی روانی، روشنی میں دمکتے ہوئے بادلوں کے پھریرے۔ یہ وہ وجود ہو جو نرم ہو، جس کا لمس ملائم ہو۔

عینی اپنے کچھ کام نمٹا کر گھر کی جانب جانے کے بجائے پریس کلب آ گئی تھی۔ اس نے ڈائننگ روم کی ایک میز پر بیٹھتے ہوئے بیرے کی طرف اشارہ کیا اور چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آ گئی۔ عینی نے چائے دانی کا ڈھکنا اٹھا کر چمچ پھیرا کہ رنگ گہرا ہو جائے۔ اتنے میں میزان قریب میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ میزان یہاں ملازم تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ خاموش تھا۔ بیرے کی اداسی امڈنے لگی تھی۔

"ہاں بولو، کچھ کہنا چاہتے ہو۔"

"جی وہ پی ایم کا انتقال ہو گیا۔"

"کیا! پی ایم ـــــ"

"جی وہ رات کو یہاں آئے تھے۔ بڑی دیر تک کارڈ روم میں کھیلتے رہے۔ اٹھتے وقت کہنے لگے۔ کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں چلتا ہوں۔"

عینی نے چائے میز پر چھوڑ دی۔ میزان سے کہا۔ "چلو۔"

عینی سمندر کے کنارے پی ایم کے نئے اپارٹمنٹ کی طرف جا رہی تھی۔ اپنے دکھ کو کم کرتے ہوئے وہ میزان سے باتیں کرنے لگی۔

"وہ ہمیشہ اپنی سالگرہ دھوم دھام سے مناتا تھا۔ بہت بڑی دعوت کرتا۔ اس کی دعوت کا کارڈ وقت سے بہت پہلے آ جاتا۔ وہ کارڈ کو خود ڈیزائن کرتا تھا۔ وہ مصور تو نہیں۔ مگر ایک آرٹسٹ بھی تھا۔ پچھلی بار اس نے کارڈ نہیں بھیجا۔ بلکہ فون کیا۔ تاکید کی کہ ضرور آنا اور سنو۔ میرا گھر بہت دور ہو گیا ہے۔ تم خود گاڑی چلا کر مت آنا میں نے ایک دوست سے کہہ دیا ہے۔ وہ تمہیں لینے آ جائیں گے۔"

"میرا خیال ہے، الٹے ہاتھ مڑنا ہوگا۔" میزان نے باتوں میں گم عینی کو راستہ بتایا۔

"تمہیں پتہ ہے۔ اب کی بار اس کی دعوت بہت اجڑی اجڑی تھی۔ کچھ جانے پہچانے لوگ ضرور تھے۔ مگر وہاں

میرا جی خراب ہوا۔ ہم کچھ دیر بعد پی ایم کو بتائے بغیر لوٹ آئے۔ پی ایم لوگوں کو منع کرتا تھا۔ لوگ جاتے رہے۔ لوگ چلے گئے۔''

گاڑی روکی۔ چوکیدار سے پوچھا۔ جی یہی بلڈنگ ہے اوپر۔ پی ایم چلا گیا تھا۔ کینوس پر اس کی ''تنہا لڑکی'' کی پینٹنگ ادھوری تھی۔

میزان نے بتایا کہ اس کی تصویروں کی نمائش ہونے والی ہے اور مجی کو آنے کی تاکید کی۔

میزان نے ڈھاکہ سے 80 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع گاؤں بری پور میں آنکھ کھولی۔ ہوش سنبھالا تو خود کو باپ کی پرچون کی دکان پر پایا۔ گاؤں کے اسکول میں ساتویں جماعت تک تعلیم پائی۔ وہ وہاں سے کہیں اور جانا چاہتا تھا۔ خود کو دریافت کرنا چاہتا تھا۔ پھر ایک روز وہ دکان کی تجوری سے کچھ رقم چرا کر بھاگ نکلا۔ کراچی جا پہنچا۔ وہ چھوٹے چھوٹے کام کرتا تھا۔ وہ روپیہ نہیں کمانا چاہتا تھا۔ بلکہ ایسا کام کرنا چاہتا تھا جس سے عزت اور شہرت ملے۔ آرٹسٹ خدا بخش ابڑو سے راہنمائی لی تو تصویریں بنانے لگا۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقع پر نوجوان مصوروں کی فہرست میں اس کا نام بھی شامل ہوگا۔ مصوری میں نمایاں کامیابیاں حاصل کرنے کے باوجود میزان کے دل میں وہ کسک باقی ہے جب مصور بننے کے ارادے کے اظہار پر اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ مگر وہ مایوس نہیں ہوا۔ اس کی تصویروں میں جو کچھ ہے وہ اس کا اپنا ہے۔ اس کی اپنی گرامر ہے۔ وہ ایک تجسس کو اپنے ساتھ لیے پھرتا ہے اور ہر لمحہ کچھ دریافت کرنے کی دھن میں رہتا ہے۔ زمانے کی ناانصافیوں اور زندگی کی ناآسودگیوں پر آزردہ خاطر ہوتا ہے۔ احتجاج کرتا ہے۔ اس کی کینوس کی کٹھ پتلیاں انسانی بے بسی کی علامتیں ہیں۔ غریب الوطنی میں اس کا دھیان بار بار اپنے سونار دیش کی جانب پلٹتا ہے۔ ممتا کی لمس کی آسودگی کا اظہار مرغی کے پروں کے چھتنار سے نقوش بنتے ہیں۔ مستقبل کی زندگی کو سینچنے والی ممتا۔ محبت، نرمی اور احساس کا عکس۔ میزان کے فن کا نمایاں عنصر اس کی بے ساختگی ہے۔ وہ رنگوں سے کھیلتا ہے۔ لیکن وہ اپنے تخلیقی کرب کو رنگ و نقش کی سنجیدہ زبان دیتا ہے۔

''ارے یہ کیا۔ ناک ہی مروڑ دیا۔'' مجی نے رشید ارشد کی ایک تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ لبرل آرٹ ہے۔'' علی امام اپنے مخصوص انداز میں بولے۔

رشید ارشد سے مجی کی یہ ملاقات اٹھارہ برس بعد ہو رہی تھی۔ گیلری کے ہال میں ان کی نئی تصویریں آویزاں تھیں۔

"آپ منظر سے ایکدم غائب ہو گئے تھے۔ جیسے ابھی ہیں اور ابھی نہیں ہیں۔"

"میں سن 75 میں امریکہ گیا تھا۔ البتہ ہر چند سال بعد پاکستان آتا رہا لیکن آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"کیوں چلے گئے تھے؟"

"اس کی بہت سی وجوہات تھیں۔ ایک تو میں ایڈونچر کرنا چاہتا تھا۔ پھر یہاں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے تھے۔ میں جس ادارے میں کام کرتا تھا وہاں میرے خلاف سازشیں چل رہی تھیں۔ لیکن وہاں جانے کے بعد میں عرصے تک کوئی تصویر نہیں بنا سکا۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہوا۔ اس دوران مجھے خود کو پھر سے دریافت کرنے کا موقع ملا۔ میری مصوری نے نیا انداز اختیار کیا۔ دراصل وہ اس وقفے کا ثمر تھا جب میں نے تصویریں نہیں بنائی تھی۔"

"مجھے آپ کی تصویریں یاد ہیں۔ آپ حروف کو تجریدی انداز میں استعمال کرتے تھے۔ وہ تصویریں آپ کی پہچان تھیں۔"

"حروف سے میری محبت ابھی تک باقی ہے۔ وہ تصویر جس پر کل حروف میں نکاح نامہ لکھا ہے۔ یہ دراصل قدیم افغانی خطاطی ہے۔ میرے ایک افغانی دوست نے جب افغانستان سے ہجرت کی تو اپنے ساتھ قدیم مخطوطات لیتا آیا۔ میں ان کے گھر میں جمع ہو گیا۔ میرا افغانی دوست ان مخطوطات کو کسی میوزیم کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہوا۔ کیونکہ وہ 50-60 سال پرانی تھیں۔ جبکہ کسی آرٹ پیس کو اینٹیک بننے کے لیے کم از کم 100 برس درکار ہوتے ہیں۔ میں نے انہیں کولاژ کے طور پر اپنی تصویروں میں استعمال کیا۔

علی امام جتنی اور رشید ارشد کی گفتگو کے دوران گھر کے اندر کی جانب چلے گئے۔ پھر لوٹے تو ہال کی بتیاں جلا دیں۔ تاکہ تصویریں واضح ہو جائیں۔

"ارے آپ نے یہ کیا کیا" جتنی نے احتجاج کیا۔

"تم لوگوں کو مزہ نہیں آ رہا ہوگا۔"

"پلیز بند کر دیں۔ ہمیں ان کے بغیر بھی بہت مزہ آ رہا ہے۔" رشید ارشد بلکا سا ہنسے۔

"ہاں تو آپ وقفے کی بات کر رہے تھے۔" جتنی نے بات آگے بڑھائی۔

"جس طرح گفتگو کے درمیان خاموش لمحہ آتا ہے۔ اگلا پوائنٹ اس کے بعد آتا ہے۔ اسی طرح موسیقی میں ہے۔ سرکا اتار چڑھاؤ ہی اسے دل آویز بناتا ہے۔ مغربی موسیقی میں اس کی بہت اہمیت ہے۔ خورشید انور کی موسیقی میں طویل وقفہ آگیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے پیانو کو طبلے کے ساتھ بلینڈ کیا۔ یہی فن کی ہر صنف کا ایوولیوشن ہے۔ اگر آپ تسلسل سے ایک نہج پر چلتے رہیں تو ایک لمحہ ایسا آتا ہے کہ وہ از خود رک جاتا ہے۔ مرنے لگتا ہے۔ اسے دوبارہ زندہ کرنے کے لیے روایتی سوچ سے

بہت ضروری ہے۔ ہجرت کے بعد نئے تجربے اور مشاہدے کو اظہار دینے کے لیے بھی مجھے کچھ وقت درکار تھا۔ ہمارے ہاں اظہار پر بہت سی پابندیاں تھیں۔ وہاں گیا تو اتنی آزادی ملی کہ اسے اپنے وجود میں جذب کرنا مشکل تھا۔ اس دوران میں نے گرافکس کی نئی تکنیکس کا تجربہ کیا اور بہت کامیاب رہا۔ لیکن بعض اوقات نوسٹلجک ہو جاتا ہوں۔ نئے اپلی کیشنز کو شامل کرتے ہوئے دھیان موہنجوداڑو کے کلچر کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ برسوں پہلے میں نے کاریگروں کے ہنڈی کرافٹس کو اپنی مصوری میں شامل کیا تھا۔ ایک بار میں نے مٹی کا بنا ہوا گھگھو گھوڑا ایک آنے میں خریدا تھا۔"

اس دوران علی امام کسی کام سے باہر جاتے ہوئے رک گئے۔ وہ گھگھو گھوڑے کے ذکر پر چونک گئے تھے۔ یہ ان کی پسندیدہ اصطلاح تھی۔ کسی پینٹر کے کام میں انہیں تخلیقی حیات اور گہرائی نظر نہ آتی تو وہ کہتے "ارے بھئی گھگھو گھوڑے نہ بناؤ۔ کینوس پر اس وقت تصویر بنانے کا ارادہ کرو جب کچھ تمہارے اندر سے نکل رہا ہو۔"

رشید ارشد نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک امریکی دوست کو مٹی کا وہ گھوڑا اس قدر پسند آیا کہ اس نے اس کے لیے ایک اسٹینڈ بنوایا۔ میں نے اس گھوڑے کے امیج کو اپنی تصویروں میں کئی بار اور کئی طریقوں سے استعمال کیا۔ میرا وہ سیریز بہت پاپولر ہوا تھا۔"

رشید ارشد نے ہجرت کے بعد نئی تکنیک کے تجربے سے کامیاب نتائج حاصل کئے۔ ان کی کمپوزیشنز میں تنوع کے ساتھ جمالیاتی تسکین بھی حاصل ہوتی ہے۔

"میں برش یا پینٹ نائف کے بجائے ہاتھوں کی انگلیوں سے تصویر بناتا ہوں۔ یہ میرا پرفارمنگ آرٹ ہے۔ اس طرح تحت الشعور اور اظہار کا براہ راست رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ کام میں احساسات اور جذبات کے علاوہ جسم بھی شامل ہو جاتا ہے۔"

"گزشتہ برسوں میں پاکستان کی مصوری میں کوئی نمایاں تبدیلی یا بہتری نظر آئی؟"

"انفرادی طور پر کچھ پینٹرز اچھا کام کر رہے ہیں۔ لیکن مجموعی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس دوران کوئی بڑا آرٹسٹ سامنے نہیں آیا۔ یہاں ابھی تک مصوروں کی 60 اور 70 کی نسل ڈومینیٹ کر رہی ہے۔"

"امریکہ کی مصوری کے بارے میں؟"

"جدید امریکی مصوری میں کوئی گہرائی نہیں ہے۔ نہ ہی امریکی مصوری کی کوئی تاریخ یا ماضی ہے۔ ان کے ہاں سب کچھ یورپ کی رینائسنس سے آیا تھا اور وہی روایت برقرار ہے۔ یورپی مصوری کے اثرات اب بھی کسی نہ کسی وسیلے سے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔"

"امریکی فنون کے نئے رجحانات؟"

''ہارڈ پورنوگرافی۔ پینٹنگ، اسکیچر اور فوٹوگرافی میں یہ رجحان نمایاں ہے۔ ان کا بنیادی مقصد تو یہ حاصل کرنا ہے۔ سنسنی پیدا کرنا ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ امریکی معاشرہ ہر طرح کی آزادی اظہار رکھنے کے باوجود اس طرز عمل کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہاں بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اس روش پر اعتراض کرتے ہیں۔''

امام بڑی دیر سے وارڈ روب میں کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ اتنے میں شہباز کو کمرے میں آتے دیکھ کر بولے۔

''شہباز، وہ میری قمیص نہیں مل رہی۔''

''کونسی۔''

''ارے بھئی وہ نیلی دھاریوں والی۔ میں نے پچھلے ہفتے پہنی تھی۔''

''میں آکر ڈھونڈتی ہوں۔ امی کو دوا دے لوں۔'' شہباز کی والدہ انہی کے ساتھ رہتی تھیں۔

''ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔''

''ذرا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا ہے۔ فکر نہ کریں ویسے ٹھیک ہیں۔'' یہ کہہ کر پھر چلی گئی۔

کچھ دیر میں وہ ونگر پر لٹکی ہوئی ان کی قمیص لے آئی۔

''یہ لیں، سامنے ہی تو تھی۔''

''ارے بھئی نہیں نظر آئی۔''

''سنیں۔''

''ہاں کیا۔''

''کل عظمیٰ کا فون آیا تھا۔ اس نے احسن کے بارے میں ایسی خبر دی کہ میں نے ڈر کے مارے آپ کو نہیں بتایا۔''

''کیا کیا اس نے۔ کسی لڑکی کے چکر میں ہے۔''

''نہیں۔''

''پھر کیا۔''

''کہہ رہی تھی، احسن نے اپنی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی ڈگری پھاڑ کر پھینک دی ہے۔''

''ڈگری..... پھاڑ کر پھینک دی؟ بیچاری ڈگری نے کیا قصور کیا تھا۔''

''کہہ رہا تھا کہ مجھے اس لائن میں نہیں جانا۔ ساری عمر جھوٹی بیلنس شیٹس بناتے رہنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں

پڑھانے کا کام کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو کیا ہوا اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔"

"دیکھیں نا جی۔ ہم نے ان بچوں کی پڑھائی پر اتنا پیسہ خرچ کیا اور اس نے سب کچھ ڈبو دیا۔"

"نہیں اس نے کچھ غلط نہیں کیا۔ بلکہ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ وہ انڈیپنڈنٹ ہو گیا ہے۔ اپنی مرضی سے زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ یہ اس کا حق ہے کہ وہ اپنے فیصلے خود کرے۔"

شہناز کے لیے اس سب کو تسلیم کرنا آسان نہ تھا۔ "ہم نے کتنی مشکلوں سے اس کو باہر بھیجنے کے لیے رقم کا بندوبست کیا تھا اور وہ......"

"شانو...... بیٹھ جاؤ۔ آرام سے سوچو اس نے وہیں جا کر یہ سیکھا۔ یہی جانا کہ وہ کس کام سے خوش ہوگا۔ ہم نے اسے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بنوایا۔ لیکن وہ ٹیچر بننا چاہتا ہے۔ یہ اس کی خوبی ہے جو آج کل کے بچوں میں کم نظر آتی ہے۔ وہ پیسہ نہیں عزت کمانا چاہتا ہے۔"

شہناز نے امام کی طرف دیکھا۔ دل میں سوچا۔ "آخر کو بیٹا کس کا ہے۔"

* * *

جینی کو شون سرکل جنکشن سے ملٹی آرکیڈ کی طرف مڑنا تھا۔ لیکن سامنے کریم رنگ کی سوزوکی آلٹو ٹریفک کی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد ہارن بجایا۔ گاڑی میں سے ایک سر جھانکا۔ "کہیے میر کیا حال ہے۔" میر نے خوشدلی سے ہاتھ ہلایا اپنی گاڑی کو ایک طرف کیا کہ جینی گاڑی نکال لے۔ جینی میر کی کھلی ہوئی مسکراہٹ سے خوش ہوئی۔ اتنے تمام برسوں میں لکھنؤ سے شون سرکل تک میر نے طویل فاصلہ طے کیا تھا۔ اسٹیرنگ پر رکھے ہوئے ہاتھوں کی گرفت مستحکم تھی۔

معاً جینی کا دھیان اس واقعے کی طرف گیا جب میر، قدسیہ اور ناہید اپنی ایک گزارش کے ساتھ انڈس گیلری گئی تھیں۔ ان دنوں گیلری میں گروپ شو منعقد ہونے والا تھا۔

"سر" میر نے اپنی ساتھیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے علی امام سے اپنا مدعا بیان کرنا چاہا۔ "ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ ہمیں بشیر مرزا، ظہور الاخلاق، گل جی یا صادقین کی صف میں کھڑا کر دیں۔ لیکن نو وارد مصوروں کے گروپ میں......" بات ادھوری تھی۔ علی امام سمجھ گئے تھے۔ ناہید اور قدسیہ تذبذب میں تھیں۔ کیا ہم نے یہاں آ کر غلطی کی ہے۔ علی امام نے ان تینوں سے گروپ نمائش میں شمولیت کے لیے ان کی پینٹنگز منگوائی تھیں۔ نمائش کی ترتیب کا پلان بن چکا تھا۔ علی امام ان سب کے لیے استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ انہیں یہ گمان نہ تھا کہ اس طرح نو آموز مصوروں کے ساتھ سینئر آرٹسٹوں کی تصویروں کی شمولیت سے

ان کی وقعت اور شہرت کو نقصان پہنچے گا۔ امام کچھ نہ بولے۔ صرف یہ کہا کہ "تم لوگ ابھی بچے ہو۔" یہ ان کی حوصلہ شکنی نہیں بلکہ ایک ترغیب تھی کہ آپ نے ابھی دور تک جانا ہے اور بہت سے مراحل طے کرنے ہیں۔

میر اقرو استر ھویں برسوں کے اواخر میں کراچی کے تصویری منظر پر آئیں۔ ٹیلنٹ کی بدولت فنون لطیفہ کے حلقے میں اپنا اعتبار پیدا کیا۔ میر کی شخصیت بیک وقت سادہ وپر کار اور پیچیدہ ہے۔ میر کو جاننے کے لیے انہیں کئی بار ملنا ضروری ہے کہ ان کی شخصیت کے پرت ایک ایک کر کے کھلتے ہیں۔ یہی ان کا انداز مصوری ہے۔

میر نے گرافکس، پرنٹ میکنگ اور پینٹنگ کے امتزاج سے متنوع نتائج اخذ کیے۔ مولٹس کی ترتیب، تجسیم رنگ، اشکال کا باہمی ربط، جزئیات نگاری کی رمزیت واضح اظہار پر غالب آجاتی ہے۔ ان کے کشتی، زنگالی، خیالے سیاہ اور بھورے رنگ گہرائی اور حساسیت کی علامتیں ہیں۔ مگر وہاں ہمیشہ افسردگی نہیں ہوتی۔ کبھی کبھار وہ کچے رنگوں کے استعمال سے رجائیت کی طرف مائل نظر آتی ہیں۔ شوخ سبز، تیز زرد اور کھلتا ہوا آسمانی نیلا میر کے ہاں علامت تمدن ہے۔ زندگی کا سلسلہ ایک زمانے سے دوسرے زمانے کی طرف جاتا ہے۔ ماضی حال میں پھوٹتا ہے۔ وہاں ہر عنصر ایک دوسرے سے مربوط ہے۔ وہ بظاہر الگ الگ نظر آنے کے باوجود کسی نہ کسی رشتے سے ایک دوسرے سے جڑا ہے۔ میر کی فگر یٹو تصاویر میں حالات سے سمجھوتہ نہیں بلکہ چہرے کی بے اطمینانی اس کے شعور کی بیداری کا پتہ دیتی ہے۔ کم تجسیموں کے استعارے پابند اظہار کو پر اثر بنانے کا وسیلہ ہیں۔ عصر حاضر کا انسان خود کو ماضی کے مطلق العنان حاکموں کی رعایا سے زیادہ آزاد تصور کرتا ہے مگر وہ کئی طرح سے مقید ہے۔ یہ قفس کبھی معروضی ہوتا ہے تو کبھی آفاقی۔ ہر ایک کا اپنا اپنا زنداں۔ وہ جو خود کو پھلتا پھولتا پاتا ہے اسے یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس کی ذہنیت اور ذہنی کیفیت کس کس طرح سے متاثر ہوتی ہے۔ میر کے فن کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنی فکر انگیزی کو جمالیات پر غالب نہیں آنے دیتیں۔

رات کے تقریباً پونے دس بجے تھے۔ بہت دنوں بعد یکسوئی ملی تھی۔ جبنی کے ہاں چند روز سے ایک دوست ٹھہری ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے گھر میں خاصی چہل پہل رہی۔ آج وہ چند گھنٹوں کے لیے اپنے عزیزوں سے ملنے گئیں تو جبنی نے سوچا کہ گھر کی بے ترتیبیوں کو سنوار کر وہ جلد سو جائے گی۔ اس نے حسب معمول بستر پر پھیلے ہوئے اخبارات کو تہ لگایا اور انہیں پرانے اخباروں کے ڈھیر میں ڈالنے کے لیے دوسرے کمرے میں گئی۔ بتی بجھائی، کھانے کی میز پر پڑے ہوئے برتن اٹھائے کہ گیٹ کی گھنٹی بجی۔ ارے، اس وقت کون آگیا۔ آواز دی۔ جواب میں ہلکی سی آواز آئی۔ نہ پہچان سکی کہ کون ہے۔ آگے بڑھ کر گیٹ کھولا دیکھا تو ظہیر الاخلاق اور شاہد سجاد کھڑے تھے۔

''ارے، آپ دونوں ایک ساتھ کیسے آ گئے۔ ظہور آپ لاہور سے کب آئے۔ شہزاد ٹھیک تھی نا، آؤ پلیز۔'' عینی نے دروازہ کھول کر دونوں کو اندر آنے کی دعوت دی۔

''مجھے معلوم ہے کہ آپ لوگ مجھ سے ملنے نہیں آئے ہو۔'' وہ دونوں کھسیانی ہنسی ہنس کر ٹالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ''آؤ، ہاں گرمی بہت ہے۔ وہ اپنے عزیزوں کے ہاں گئی ہے۔ اس کے لیے دعوت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ میں نے معذرت کر لی تھی۔ دیکھو، میرے پاس ایک ہی ایئر کنڈیشنر بیڈ روم میں ہے۔ آپ کو وہیں بیٹھنا ہوگا۔ چلیں کرسیاں لے چلتے ہیں۔''

''نہیں نہیں، ہم فرش پر ہی بیٹھ جائیں گے۔''

''کب تک آئیں گی؟''

''یہ معلوم نہیں۔ خاندان بھر کے لوگ جمع ہیں۔ لیکن گھر قریب میں ہے۔ کچھ دیر ٹھہرو پھر ہم وہیں چلیں گے۔ آپ لوگ اتنی دور سے آئے ہو۔ اس سے ملنا ضروری ہے۔''

''ہاں، آپ کیا لیں گے۔''

''کچھ بھی نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کچھ لے کر آتی ہوں۔''

''میں مدد کروں۔''

''نہیں۔ تکلف نہیں ہے۔ بجلی بار بار جاتی ہے۔ پانی زیادہ ٹھنڈا نہیں ہے۔ دیکھوں، برف ہے کہ نہیں۔'' عینی نے ٹرے میں رکھے ہوئے گلاس اور مشروب میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''ظہور آپ کہاں ٹھہرے ہیں۔''

''شاہد کے ہاں۔ میں کراچی آتا ہوں تو اسی کے پاس ٹھہرتا ہوں۔''

ارے یہ دونوں۔ دونوں کے دونوں خاموش طبع، کم گو، نرم خو، شائستہ۔ یہ لوگ دن بھر میں ایک دوسرے سے دو چار جملے ہی کہتے ہوں گے۔ عینی نے دل میں سوچا۔

شاکر علی پاکستان میں جدید مصوری کے باپ تھے اور ظہور الاخلاق ان کی جائز پہلی اولاد ہیں۔ ظہور نے نہ صرف ان سے مصوری کی تربیت حاصل کی بلکہ وہ ان کی قربت اور صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ ظہور ایک فطری مصور ہیں۔ جس کے سوتے ان کی گہری سوچ سے پھوٹتے ہیں کہ انہیں مشاہدے اور عام زندگی کی راحتوں، محرومیوں اور ناآسودگیوں کا ادراک ہے۔ ظہور کا فن مصری نقاشوں کو روایتی طرز مصوری سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ وہ فنون لطیفہ کی جدید اور تجریدی جہتوں سے

روشناسی کے ساتھ ساتھ اپنی ثقافت اور پہچان کو برقرار رکھتے ہیں۔ فنکار کے اندر کا موسم اپنے وقت سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ وقت اگر ایسا ہے کہ وہاں سورج نہیں نکلتا۔ گلاب کے پھول نہیں کھلتے۔ وہاں انحطاط اور پژمردگی ہے تو اس کا اظہار بھی اس وقت کی ضرورت ہے۔ یہی اس دور کی سچائی ہے۔ تمہور کے رنگوں کا انتخاب جبلی ہے۔ ان کی تجریدی اشکال بنتے ہوئے دائرے اور تکونیں سطح کی وسعتوں پر اپنی اپنی ہیئت میں مکمل ہیں لیکن ان کے مابین مضبوط ارتباط ہے۔ ایک دوسرے کو توازن دیتے ہیں جیسے دو متضاد افراد کا باہمی رشتہ۔ کبھی وہ سیاہ رنگ کو بکثرت استعمال کرتے ہیں جو سوگواری کی علامت نہیں بلکہ گہرائی کا عکاس ہے۔ تمہور کے ہاں ٹھوس بیان نہیں ہے بلکہ تجویز کی نرمی اور لچک ہے۔ وہ تصویر اور ناظر کے درمیان مکالمہ قائم کرتے ہیں۔ وقت نے، حالات نے انسان کی نفی کی۔ لیکن انسان کے لیے اپنے محسوسات اور اقدار کی نفی کرنا ممکن نہیں۔ تمہور کے فن کا یہی مطمع نظر ہے۔ یہی وہ جمالیاتی مسئلہ ہے جسے وہ برسوں سے رنگ و نقش کے رچاؤ سے حل کرنے میں مشغول ہیں۔

"ہاں بھئی، شانو کدھر ہو۔" علی امام نے شہناز کو آواز دی۔

شہناز دوسرے کمرے سے امام کی آواز سن کر چونکی۔

"ارے آپ یہ صبح صبح تیار ہو کر کہاں جا رہے ہیں۔"

"ذرا انکل سریا ہوسپٹل تک جا رہا ہوں۔"

"ہوسپٹل جا رہے ہیں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا۔"

"ارے بابا، میں ٹھیک ہوں، مینی کا آپریشن ہوا ہے۔"

"کا ہے کا۔ آپ نے مجھے تو نہیں بتایا۔"

"معمولی بات ہے۔ اپینڈیکس کا ایمرجنسی آپریشن ہوا ہے۔"

ہوسپٹل کا دروازہ کھلا۔ ایک دن پہلے ہی آپریشن ہوا تھا۔ مینی غنودگی میں تھی۔ اپنے سامنے علی امام کو دیکھ کر چونکی۔ اٹھنے کی کوشش کی۔ نرس نے منع کیا۔

"امام صاحب آپ کیسے پہنچ گئے۔ آپ کی آنکھ میں تکلیف تھی۔ کیسے آئے ہیں۔ اور پھر تیسری منزل تک کیسے پہنچ گئے۔ نہیں۔ یہ زیادتی ہے۔" مینی حیرت زدہ تھی۔

"ارے بھئی عشق کا معاملہ ہے۔ میں کیسے نہ آتا۔"

امام حسب عادت مسکراتے ہوئے مینی سے فلرٹ کر رہے تھے۔ معاً ان کی نظر کمرے میں موجود ایک خاتون پر پڑی۔

مسکرائے۔ ایک روایتی قسم کی گھریلو عورت کو سمجھانا ضروری تھا۔ ہنسنے لگے۔ "یہ پلاٹونک عشق ہے۔"

اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ ویسے بھی ان محترمہ کو یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ پلاٹونک عشق کیا ہوتا ہے۔ چاہے اسے ترجمہ کر کے افلاطونی عشق ہی کیوں نہ کہا جائے۔ بیگم نے دل میں سوچا۔ لیکن وہ علی امام کے آنے پر کس قدر خوش تھی وہ اس کے چہرے پر لکھا تھا۔

"پگلی لڑکی ہے وہ"

"کون؟"

"سنبل ظہیر۔"

"کیسے؟"

سن 71 میں سنبل ظہیر کی تصاویر کی پہلی نمائش ہوئی۔ انٹرویو شائع ہوا۔ جسے چغتائی نے پڑھا۔ متاثر ہوئے۔ گیلری کی وساطت سے سنبل کے نام خط لکھا اور ساتھ مرقع چغتائی کا تحفہ بھیجا۔ خط و کتابت کا سلسلہ چل نکلا۔ چغتائی نے سنبل کو لاہور آنے کی دعوت دی۔ وہ چل پڑی اور لاہور پہنچ گئی۔ جو کوئی سنتا کہ یہ لڑکی ملک کے نامور مصور عبدالرحمن چغتائی سے ملنے آئی ہے تو اس کا مذاق اڑاتا۔ "ارے بھئی انہوں نے مجھے خود بلایا ہے۔" سنبل جواز پیش کرتی۔ سنبل چغتائی کے گھر پہنچ گئی۔ جواب ملا کہ وہ اس وقت موجود نہیں ہیں۔ سنبل پندرہ روز تک مسلسل وہاں جاتی رہی اور یہی جواب ملتا رہا۔ بالآخر وہ مایوس ہو کر کراچی لوٹ آئی۔ اس نے چغتائی کے نام خط لکھا۔ دو تین ہفتوں کے بعد ان کے بھائی کا خط آیا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

انڈس گیلری میں اس روز معمول سے زیادہ رش تھا۔ سنبل ظہیر کی نیوڈز کی نمائش تھی۔ عورت کے گیسو، رخسار اور ہونٹوں کا ذکر رومان پرور ہوتا ہے لیکن جب بات بدن تک آجاتی ہے تو ولولے کا پیدا ہونا لازمی ردعمل ہے۔ لوگ چونکتے ہیں۔ متجسس ہوتے ہیں۔ لذت کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ صنف کوئی بھی ہو۔ بیان حروف میں ہو یا رنگ و نقش میں۔

سنبل کو یقین تھا۔

روزن سے جھانکنے سے کبھی سراپا نظر نہیں آتا۔

لیکن اس نے شائقین کو نیکڈ اور نیوڈ کا فرق بتایا تھا۔ وہ جارج ایلیٹ کی طرح ماحول سے بغاوت کرتے ہوئے بےباکانہ انداز اپناتی ہیں۔ مگر وہاں ایک مہین پردہ ڈالے ہیں۔ سنبل کی نیوڈ بھی اداس دکھائی دیتی ہے تو کبھی شاور کی پھوار میں

بھیگے بالوں سے الجھتی ہے۔ اور کہیں وہ ساحل سمندر کی گیلی ریت پر تھکی تھکی بیٹھی ہے۔ سنبل کے رنگ نرم اور خطوط میں بہاؤ ہے۔ اس کی دھار میں کچھ بھی نوکیلا نہیں ہے۔ بلکہ غزل کے مصرعوں کی طرح مترنم اور متوازن ہے۔ دھیمے سروں کی راگنی کی مانند۔

شہناز نے میز پر کھانا رکھا۔ امام کو آواز دی کہ کھانا تیار ہے۔ دونوں نے اپنی اپنی پلیٹوں میں کھانا ڈالا۔ شہناز نے ہاٹ پاٹ سے چپاتی نکال کر امام کی پلیٹ رکھی۔

"سنیں۔"

"ہاں سن رہا ہوں۔ کیا بات ہے۔ خیریت ہے نا۔"

"سب ٹھیک ہے۔ وہ۔۔۔ اقبال مہدی کا فون آیا تھا۔"

امام کا ماتھا ٹھنکا۔ "مجھے معلوم ہے کیا کہہ رہا ہوگا۔ وہ تین اور لوگوں نے بھی اس کا پیام دیا ہے کہ میں اسے نمائش دوں۔"

"تو پھر۔۔۔؟"

"تمہیں معلوم ہے شانو۔ اس کا کام ہنڈس گیلری کے مزاج کا نہیں ہے۔ میں۔۔۔"

"اقبال مہدی پیارا آدمی ہے۔ اس کے کام کو پسند کرنے والوں کا ایک حلقہ ہے۔ اس کا حوصلہ بڑھے گا آپ انکار نہ کریں۔"

"اچھا۔۔۔ سوچوں گا۔" امام نے پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

عینی نے اخبار میں ہنڈس گیلری میں اقبال مہدی کی تصاویر کی نمائش کی خبر پڑھی۔ "ارے یہ کیسے ہو گیا۔"

پھر اس روز اقبال مہدی کی تصاویر دیکھنے بہت لوگ آئے تھے۔ وہ ہنڈس گیلری کے مخصوص گراہکوں سے مختلف تھے یہ وہ لوگ تھے جو تجریدی مصوری کی علامتوں اور استعاروں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ جو رنگ و نقش کی آمیزش اور اس کے امتزاج کو محسوس نہیں کرتے۔ وہ ایک واضح تصویر دیکھنا چاہتے ہیں اور خوش ہو جاتے ہیں۔ اقبال بھی بہت خوش تھا۔ سب سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ عینی اقبال سے ہیلو ہائے کے بعد آگے بڑھ گئی۔

"سنیں۔" پیچھے سے آواز آئی۔

عینی رکی۔ پلٹ کر دیکھا۔ اقبال مہدی کہہ رہا تھا۔ "آپ مجھ پر کیوں نہیں لکھتیں۔" سیدھا سا سوال تھا۔ ٹالنے کی

گولی جیسا۔

عینی کے پاس فوری جواب نہیں تھا۔ شرمسار تھی۔ اقبال مہدی کے چہرے کے بھولپن نے اسے سوال سے زیادہ پریشان کر دیا تھا۔

اگلے روز عینی نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا تو اقبال مہدی لائن پر تھا۔ "میں شام کو گاڑی بھیج رہا ہوں۔ آپ کو آنا ہے۔" ایک خواہش مان بن گئی تھی۔ عینی کے پاس انکار کا چارہ نہیں تھا۔ اقبال مہدی نے اپنے نوعمر شاگرد فرخ شباب کو لینے بھیجا تھا۔

اقبال مہدی گھر پر اکیلا تھا۔ عینی کو سامنے پا کر فرطِ جذبات سے اٹھا۔ خوش آمدید کہا۔ میں مشکور ہوں، آپ آ گئیں۔

عورت کے حسن، اس کے بناؤ سنگھار، اس کی اداؤں اور رعنائیوں کا مصور کہہ رہا تھا۔

"میں اپنی تصویریں لے کر علی امام کے پاس گیا تو انہوں نے بہت سی تصویریں یہ کہہ کر ریجیکٹ کر دیں کہ یہ کمزور ہیں۔ ان کی تفصیلات حذف کرو۔ میں نے ان کی بات مان لی۔ میں جانتا ہوں کچھ لوگ میرے کام کو پسند نہیں کرتے۔ یہ وہاب جعفر، چغتائی وغیرہ مجھے آرٹسٹ نہیں سمجھتے۔ لیکن یہ جو ایبسٹریکٹ آرٹ ہے نا، یہ سب فراڈ ہے۔ میں ایک ریلسٹ آرٹسٹ ہوں۔ ایبسٹریکٹ آرٹ نے پینٹنگ کے دھارے کا رخ بدل دیا ہے۔ میں پرانے دھارے پر چل رہا ہوں اور میں یہی کچھ کروں گا۔ میں ہندوستان سے پاکستان آیا تو عرصے تک صادقین کے ساتھ رہا۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ یورپ میں بڑے بڑے آرٹسٹوں کا کام دیکھا۔ مطالعہ کیا۔ لیکن میں نے اپنی روش تبدیل نہیں کی۔" اقبال مہدی کے گلاس میں برف کی کیوبز پگھل گئی تھیں۔

شہر میں بہت سی آرٹ گیلریاں کھل رہی تھیں۔ ایک نئی گیلری کے افتتاح پر جمیل نقش کی تصویری نمائش کا پڑھ کر عینی کا دل اچھلا تھا۔ اسے آج تو ملاقات ہو ہی جائے گی۔

برسوں پہلے کی بات ہے۔ پی ای سی ایچ ایس کے بلاک ۲ میں واقع ایک گیلری میں تصویری نمائش کے بعد جمیل نقش گیٹ پر مل گئے۔ "ارے اچھا ہوا آپ سے ملاقات ہو گئی۔ مجھے آپ کا انٹرویو کرنا ہے۔"

گھنے سیاہ بالوں، قمیص پتلون میں ملبوس جمیل نقش نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"چھوڑیں، میرا انٹرویو لے کر کیا کریں گی۔" عینی نے سوچا کہ ایسے ہی تکلف برت رہے ہیں۔ ایک دن میں ان کا انٹرویو ضرور کروں گی۔ مگر ایسا کبھی نہ ہو سکا۔

ایک بار لاہور سے ایک بڑے ادیب کا فون آیا۔ کہا "میں کراچی آ رہا ہوں۔ مجھے جمیل نقش سے ملنا ہے۔"

"مشکل ہے۔"

"کیوں؟"

"وہ کسی سے نہیں ملتے۔"

"مجھ سے بھی نہیں۔" ان کے لہجے میں اپنے ادبی مقام کا زعم تھا۔ پھر معلوم نہیں کہ ان دونوں کی ملاقات ہوئی یا نہیں۔

عینی گیلری میں جمیل نقش کو ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ کہیں نہیں تھے۔ پوچھا۔ "کہاں ہیں؟"

"گھر پر ہیں۔"

"کیوں؟"

"یہاں کی تصویروں کی نمائش ہے۔ لوگ پکاسو کا کام دیکھنے آتے تھے۔ پکاسو نہیں۔"

"لیکن مجھے تو اپنے پکاسو ہی سے ملنا تھا۔"

اس روز نقش کی عورت اور کبوتر بھی نہیں تھے۔ یہ زیادتی ہے۔ ستم ہے۔ عورت اور کبوتر جمیل نقش کی پہچان ہیں۔

وہ ایک عبوری دور تھا۔ جب نقش حرف کی جانب مائل ہوئے تھے۔ پرانے مخطوطات منی ایچر کے سائز میں، چھوٹے چھوٹے فریموں میں ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہوئے، ایک دوسرے سے الجھتے ہوئے حروف۔ مگر کئی بار عورت کی جھلک ناگزیر ہو گئی تھی۔ غیر واضح اور تجریدی انداز میں۔ جمیل بیک وقت امپریشنسٹ اور کیوبسٹ ہیں۔ ان دونوں اسلوب کے امتزاج سے کرداروں کے دو خوبصورت اور ملائم پیکر ہر بار نئی تازگی لیے ظاہر ہوئے۔ کبھی پیغام میں سریلا پن تھا تو کبھی مضبوط گرفت میں احتجاج کی علامت کے طور۔ وہ سب جو خیال کو بہلاتا ہے۔ منظر کو سجا دیتا ہے۔ عورت کے چہرے کے خدوخال جسم کے ابھرتے اور گرتے ہوئے خطوط، گولائیاں اور زاویے، نقش کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ جہاں تخلیق اور تخلیق کار یک جان ہو جاتے ہیں۔ رنگ و نقش ایک دوسرے میں گھلتے ہوئے۔ فنون لطیفہ کی کلاسیکی صنف کے معانی سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔

عینی کو اس روز کی ڈاک سے قارئین کے بہت سے دیگر خطوط کے ساتھ ایک خط لاہور کی ہیرا منڈی سے موصول ہوا تھا۔ اسکول کی کیمسٹری کی کاپی کا ایک ورق۔ یہ خط نو عمر لڑکی کا تھا۔ اس نے مدد مانگی تھی۔ وہ اپنی موجودہ زندگی سے تنگ آ چکی تھی۔ عینی نے خط کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہاں کوئی پتہ نہیں تھا۔ اس کی کس طرح مدد کی جائے۔ عینی کو اپنی بے بسی پر افسوس ہو رہا تھا۔

ایک مریض سگمنڈ فرائیڈ کے پاس گیا۔ معائنے کے بعد فرائیڈ نے اس سے پوچھا۔ "ڈو یو ہیو سیکس" مریض نے انکار کر

دیا۔ "بے وقوف تو جاؤ سیکس کر دیں۔"

وہ فرائیڈ تھا۔ ماہر نہیں ہو سکتا۔ کوئی ماہر نفسیات اپنے مریض سے یہ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایسا ہوتا ہے۔ سیکس بکتا ہے۔ خریدا جاتا ہے۔ لیکن اس کا ذکر فحش ہے۔

وہ لڑکی کون تھی۔ اغوا کی گئی تھی۔ کسی دلال نے اسے وہاں تک پہنچایا تھا۔ اسے کبھی نجات ملی یا نہیں۔

اقبال حسین نے ایسی بہت سی کہانیوں کو، ان حقیقتوں کو بہت قریب سے دیکھا۔ اس علاقے کے نواح میں رہنے کے طفیل وہ ان تک ہوئی جوانیوں تک رسائی اور اپنی کینوس کے لیے مواد حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ وہ ان چہروں کے کرب، اضطراب، آنکھوں کی وحشت کو گرفت میں لے آئے۔ مگر بیان میں تہذیب ہے۔ نہ وہ غیر ضروری تفصیلات میں چھپانا چاہتے ہیں، وہ جھجکتے ہیں۔ خود کو پابند محسوس کرتے ہیں۔ مصوری کی وساطت سے ایک تکلیف دہ حقیقت کو اجاگر کرنا اقبال حسین کا ایک جرأت مندانہ اقدام تھا۔ وہ جرأت جو منٹو اور کرشن چندر کے قلم میں تھی۔

ٹھوڑی چہروں والی عورتیں، زندگی کے معنی سمجھنے کی جستجو میں، وہاں تعجب ہے۔ غصہ نہیں۔ اندر کے اضطراب پر ضبط کا حصار ہے۔ بازنیں ماتی ٹوٹتے ہوئے حوصلوں کو سنبھالا دیا ہے۔ آپ کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئیں۔ کبھی یہ بھی ہوا کہ وہ آپ کو نظر انداز کر کے کہیں اور جواب دیکھنے لگیں۔ کچھ خوف، کچھ امید، ہونٹوں پر مسکراہٹ آتے آتے رک گئی۔ حالات سے نباہ کرنے والے رویے۔ منظر میں اپنا آپ نمایاں کیا تو خود کو وہاں طبعی طور پر موجود ہوتے ہوئے بھی الگ کر لیا۔ ٹھوڑی کو ہاتھوں پر ٹکا کر یوں لگا جیسے بند مٹھی نے بہت ساری اکتاہٹوں اور محرومیوں کو سمیٹ لیا ہو۔ نسائی چہروں کی اکثریت میں مرد کا اپنا عورت سے تعلق کے حوالے سے ہے۔ کبھی وہ اپنے سوال کا جواب چاہتا ہے تو کہیں وہ وقت کے خوشگوار احساس سے عاری نظر آتا ہے۔

وہ لوگ جو روہ دہ فرزندی کو مختلف وقتوں، مختلف جگہوں، دیہی علاقوں یا عوامی قہوہ خانوں میں ملے تھے۔ وہ جو اقتصادی اعتبار سے بہتر افراد کی موجودگی میں خود کو بے آرام محسوس کرتے ہیں۔ روہ دہ کے نزدیک عورت کا وجود تصویر کائنات کا وہ رنگ نہیں جو دل کو بھاتا ہے۔ جذبات کو مشتعل کرتا ہے۔ عورت ایک فرد ہے۔

الحمرا گیلری پی ای سی ایچ ایس سے باتھ آئی لینڈ منتقل ہو چکی تھی۔ جمی نے جب سے اخباری ملازمت سے استعفیٰ دیا تھا اس کی سرگرمیوں میں کچھ سست روی آ گئی تھی۔ لیکن اس نے اپنے روابط کو برقرار رکھنے کے لیے تصویری نمائشوں اور مذاکرات میں جانا نہیں چھوڑا تھا۔ اس روز گیلری میں بہت رونق تھی۔ جاتے ہی روہ دہ پر نظر پڑی۔ طویل عرصے بعد ملاقات ہوئی تو بہت

سی باتیں کرنے کی تھیں۔ ممنی اور روحہ ہال کے ایک کونے میں کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئیں۔ گپ بازی، قہقہے، علی امام اپنے مہمانوں کو رخصت کر کے اندر آئے تو ان دونوں کو باتوں میں مصروف دیکھ کر رکے۔

"سنو" کچھ لمحوں کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کس سے بات کرنے والے ہیں۔ دونوں متوجہ ہوگئیں۔ "جب بھی کوئی نمائش ہو۔" اب ان کے چہروں پر تجسس تھا۔ "تم لوگوں کو کوئی کام ہو یا نہ ہو (مثلاً ریویو لکھنا ہو یا تصویر خریدنی ہو یا نہ۔۔۔۔) تم نمائش کے موقع پر آجایا کرو۔ گیلری میں رونق ہو جاتی ہے۔"

"امام کے گرد و پیش میں ان کے اندرون میں رونقیں بکھیرنے کی ہیں کیا۔" ممنی کے دل نے سوال کیا تھا۔

روحہ اور ممنی امام کی خواہش پر کھل اٹھیں۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ضرور کریں گی۔

پورٹریٹ مصوری کی وہ صنف ہے جس میں مقبول کی ظاہری ہیئت کو ہو بہو پیش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہ فن زمانہ قدیم سے جاری ہے۔ جب دیوتاؤں اور حکمرانوں کی شبیہیں بنائی جاتی تھیں۔ انسانوں کے علاوہ پالتو جانوروں کی پورٹریٹس بھی بنائی گئیں۔ رومیوں کا تقاضا تھا کہ اصل کو بے کم و کاست پیش کیا جائے۔ یہ روایت انہوں نے یونانیوں سے لی تھی۔ جبکہ مصری فن کاروں نے مشابہت پر نسبتاً کم توجہ دی۔ وقت کے ساتھ پورٹریٹ کے موضوعات اور ساخت میں بھی تبدیلی آئی۔ یورپ کی پورٹریٹس میں شخصی مقام اور قدر و منزلت کی اہم گواہیاں ملتی ہیں جبکہ پوسٹ امپریشنسٹ مصوروں، پال گوگاں اور وان گوف نے اپنے قرب میں پائے جانے والوں کی تصویریں بنائیں۔ مودی گلیانی نے فورم اور رنگ کے پابند رہتے ہوئے ماڈل کی شخصیت کے اندرونی عطر کو اپنے مخصوص تجریدی انداز میں پیش کیا۔ سیزان نے غیر ضروری تفصیلات کو حذف کر کے تسہیل نگاری کی۔ فرانس ہیلز ایک ۱۱۱ ایسٹ پینٹر تھا۔ لیکن اس نے انسانی چہرے کو بگاڑنے کے بجائے اسے دلکش بنایا۔ رکی ہوئی مسکراہٹ، الجھے، بل کھاتے ہوئے رنگوں کے بکھرے بالوں اور گریبان کے پھول فن کار کی ستائش اور جذبات کی عکاس تھے۔

علی امام پورٹریٹس بنا رہے تھے۔ وہ گوگاں اور وان گاف کی طرح اپنے ساتھ کسی نہ کسی رشتے سے جڑنے والوں کی پورٹریٹس تھیں۔ ان افراد کے چہرے جن کی شخصیت سے متاثر تھے۔ وہ ان سے محبت کرتے تھے۔ علی امام ایک امپریشنسٹ پینٹر ہیں۔ مطلب نائف کے چھوٹے چھوٹے اسٹروکس سے بنوائے ہوئی تصویریں۔ وہاں حقیقی مشابہت کی پابندی نہیں ہے۔ ایک تاثر تھا جو دراصل فن کار کا خراج عقیدت تھا، ان شخصیات کے لیے جنہوں نے ان کی زندگی پر نقش چھوڑے تھے۔

اپنی رہ قوتوں سے، اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے، اپنی انسانی اقدار سے، روشن خیالی سے، فکر کی وسعتوں سے، خیال کی سچائی سے۔

مینی کو اس شام یاد آئی نیند میں کسی دوست کے ہاں ڈنر پر جانا تھا۔ اس نے علی امام کو فون کیا۔

"کیا میں شام کو ۵ بجے آپ سے مل سکتی ہوں۔"

امام ہنسنے لگے۔ "ضرور آؤ، ویسے بھی تم سے بہت روز سے ملاقات نہیں۔"

"میں بھی کچھ وقت آپ کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔"

"میں انتظار کروں گا۔"

شام کو مینی انڈس گیلری پہنچی۔ گھنٹی بجائی تو فریمر نے گیٹ کھولا۔ وہ بہت سے فریم، کیل، ہتھوڑی، آری اپنے ارد گرد پھیلائے ہوئے تھا۔ مینی نے ہال میں داخل ہوتے ہی عادتاً آواز لگائی۔ "ہیلو دو" شہناز کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ "اوپر ہیں۔ اپنے اسٹوڈیو میں۔ چائے ہو گی۔" شہناز نے بغیر کسی تمہید کے مینی کو اوپر جانے کی راہ دکھائی۔

"ٹھیک ہے۔ میں چائے پیوں گی۔" مینی نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا۔

اس روز امام کچھ تھکے موڈ میں تھے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ کافی عرصے سے نظر بھی کمزور ہو رہی تھی۔

مینی نے ایک نظر کمرے میں موجود اشیا پر ڈالی۔ فرش سے چھت تک اٹھے ہوئے شیلف میں ہمیشہ کی طرح چھوٹے چھوٹے مجسموں، قدیم ظروف سازی کے نمونوں کی ایک دنیا سی بنی ہوئی تھی۔ دوسری طرف ان تصویروں کا ڈھیر تھا جو لوگ گزشتہ برسوں میں انڈس گیلری کے مہمان بنے تھے۔ وہ جو تصویروں کی نمائشوں میں آتے تھے۔ اتوار کی دوپہر میں ادب، سیاست اور ثقافت پر گفتگو کرتے ہوئے گزارتے تھے۔ وقت آگے بڑھا تھا۔ ساعتیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی تھیں۔ قدیم ہنرمندی سے عصری مصوری کے رجحانات تک۔

"آؤ بیٹھو۔ تم نے فون کیا تو میں نے یہ فائلیں نکال کر رکھ لیں۔" انہوں نے سائیڈ ٹیبل سے ایک فائل اٹھائی۔ مینی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کچھ۔"

اخباری تراشے، ریویو، ان کی تصاویر پر لندن میں شائع ہونے والے تبصرے۔ ان کے فن کا سفر، وارڈ گر، ملٹی میڈیا

اور اینکر ینگ سے بنائی گئیں تصویروں کا عکس۔

نجمی فائلوں کے ورق پلٹتے ہوئے ان پر چسپاں اخباری تراشوں کو بغور دیکھتے ہوئے کچھ پریشان ہو گئی۔ وہ خوش بھی تھی کہ آج کی ملاقات میں کوئی اور مخل نہیں تھا۔

لیکن آج امام کو یہ خیال کیوں آیا کہ وہ مجھے اپنی زندگی کی جھلکیاں دکھائیں۔ نجمی اپنے آپ سے سوال کر رہی تھی۔ اس کا دل کچھ بجھ سا گیا تھا۔

اس روز وہ اسپتال کے کمرے میں موجود ڈاکٹروں کی بڑھتی ہوئی تگ و دو ان کے چہروں کی پریشانی کو خاموشی سے تک رہے تھے۔

شہناز آ گئی تھی۔ اسے دیکھ کر ہلکا سا مسکرائے۔

''شانو وہ روشن آرا بیگم کا گایا ہوا گیت ہے نا۔''

''کونسا؟''

''وہ بجاؤ والا۔''

''ارے ہاں، کیسی بھول بھی ہو رہے بھا۔''

''ہاں یہی مجھے روشن آرا بیگم کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مگر بول سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

شہناز ان کے قریب بیٹھ گئی۔ آپ بے بے دھنی راگ میں ''میرے مندر راجو نہیں آئے۔'' بھی تو سنا کرتے ہیں۔''

امام سوچوں میں گم تھے۔ ان کی خاموشی دیکھ کر شہناز بے قرار ہو گئی۔ ''سنیں، طبیعت ٹھیک ہے نا۔''

''میں ٹھیک ہوں۔ تم پریشان نہ ہو۔ اچھا تم گھر جاؤ اور میرے لیے آلو قیمہ پکا کر لاؤ۔ تھوڑی دال بھی بنا لینا۔'' شہناز نے چاہتے ہوئے بھی چلی گئی۔

شام ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں کی سرگرمی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ امام نے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں شہناز واپس تو نہیں آ گئی۔ کیونکہ وہ جو کرنے جا رہے تھے اس پر وہ بہت گھبرا جاتی۔

امام نے ٹیلی فون کا ایک نمبر ملایا۔ کال ریسیو کرنے والے کی خیریت دریافت کی اور کہا۔ ''سنو میں آج رات بارہ بجے کے بعد نہیں ہوں گا۔''

اگلے روز عبادت گاہ کے صحن میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان کے سروں پر سورج کی روشنی جگمگا رہی تھی۔ وہ سب کے سب خلا میں کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ باادب کھڑے تھے۔ وہ اس شخص کو الوداع کہنے آئے تھے جو اپنا کام ختم کر کے دالان سے باہر جانے والے راستے پر ایک کھاٹ پر بڑے سکون سے گہری نیند سو رہا تھا۔

حرفِ آخر

علی امام آرٹ میں سانس لیتے تھے۔ آرٹ میں زندگی بسر کرتے تھے۔ آرٹ کا فروغ ان کا مقصدِ حیات تھا۔ کراچی میں گیلری کلچر کا ارتقا انہی کا مرہونِ منت ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصے کا مواد علی امام کے ساتھ کئی گھنٹوں پر مشتمل گفتگو اور برسوں کی ملاقاتوں کا حاصل ہے۔ جبکہ دوسرے حصے نقش گراں، میں 70 سے 90 کے عشروں کے دوران کراچی اور خصوصاً انڈس گیلری میں منعقد ہونے والی تصویری نمائشوں کی رپورٹس، ریویوز اور مصوروں کے انٹرویوز پر مبنی ہے جو تقریباً 20-25 سال کے عرصے میں ہمارے ہاں کے طرزِ مصوری کی عکاسی کرتی ہیں۔ وقت کے ساتھ مصوروں کے ارتقائی عمل، اسلوب، رجحانات اور تصور میں تبدیلی ناگزیر تھی۔ زیرِ نظر کتاب میں 90 کی دہائی کے بعد پاکستان کے طرزِ مصوری کی نشاندہی شامل نہیں ہے۔

یہ تصنیف علی امام کی زندگی کی دستاویز ہے۔ جس میں قارئین کی دلچسپی کے لیے چند حقائق کو فکشن کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ نیز اس دور کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کو بھی مدِنظر رکھا گیا ہے تاکہ قاری یہ جان سکے کہ فن کی نشوونما میں معروضی احساسات کے علاوہ عام حالات کس طور اثر انگیز ہوتے ہیں۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ مصوری کی جو اصطلاحات عالمی سطح پر استعمال کی جاتی ہیں، ان کا ترجمہ قصداً نہیں کیا گیا۔ مثلاً امپریشنزم کو تاثریت، ایکسپریشنزم کو اظہاریت یا کیوبزم کو مکعبیت کہنے سے کنفیوژن اور ابلاغ میں رکاوٹ آنے کا احتمال ہے۔ مصوری کے کسی بھی اسلوب یا تحریک کے اصل نام کی آگہی کے بعد اپنے تئیں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بہت سے مخفی رموز روشن

ہو جاتے ہیں۔

اس کتاب کے ضمن میں جن دوستوں نے تعاون کیا وہ ہیں ـــــ شہناز امام، حسن رضا، وہاب جعفر، ناہید رضا، قدسیہ نثار، مہر افروز، عابد حسن منٹو، نوشابہ زبیری، سلیمہ ہاشمی، رشید جعفر احمد اور راجہ زبیری۔ میں ان کی تہہ دل سے ممنون ہوں۔

ش۔ فرخ

Bibliography

Abindranath Tagore--------------------www.culturalindia.net

Ahmed Perwaiz----------------------Wahab Jaffar

Ali Imam---------------------------Marjorie Hussain

Amrita Shergill--------------------www.sikhchic.com

Art in London------------------- Brian Dobbs

Camille Pissarro-----------------www.camille pissarro.org

Collage ---------------------www.google.com

Dadaism---------------------------www.arthistoryabout.com

Impressionism----------------------Joseph-Emil Muller

Cubism----------------------------www.google.com

Damoh----------------------------http//:damohportal.com

Delhi-------------------------------Khushwant Singh

Impressionism----------------------Joseph-Emil Muller

Indian Mythology------------------Kanat's Potpourri

India Schools of painting---------------http// artworld.uea.ac.uk

Islamic Arts-----------------------Jonathan Bloom and Sheila Blair

JJ College of Architecture---------------www.sirjjarchitecture>org

Modern Art & India----------------www.buzzle.com

Modigliani-------------------------Bernard Zurecher

Muqalat-e-Chughtai---------------A publication of Pakistan National council of Arts (PNCA)

N.S.Bendre---------------------www.indianartcircle.com

Paul Cezanne-------------------------www.paul-cezanne.org

Paul Gauguin-----------------------www.paulgauguin.net

Portrait Painting-----------------www.google.com

Problems of contemporary Aesthetics-------------------------Azes T.Lybumaimva

Progressive Art Circle-----------http:// theory.tifr.res

Rabia Zubairi-------------------Rafi-u-Zaman

Reason in Art--------------------George Santayana

Sculpture-------------------------www.google.com

Salvador Dali------------------------www.salvador-dali.org

S.H.Raza----------------------------www.artnet.com

Surrealism--------------------Andre Breton

Tareekh-e-Multan--------------Munshi Abdul Rehman Khan

Talash-e-Haque-Biography of Gandhi ---Dr.Syed Abid Hussain

Train to Pakistan----------------------------Khushwant Singh

Types of Indian Paintings---------www.indianetzone.com

Unveiling the Visible-----------------Salima Hashmi

Visual Arts of the Indian Subcontinent--------------www.google.com

Audio recording--------------Ali Imam, M.F. Hussain, Rashid Arshad, Souza, Iqbal Mehdi

Reports, interviews of the painters (first person experience of the author) published in Akhbar-e-Khawateen in 1970's- 90's

---